عبدالحمید صدیقی

ایمان اور اخلاق

البدر پبلی کیشنز لاہور

ایمان اور اخلاق

عبدالحمید صدیقی

البدر پبلیکیشنز
۴ بی ۰ اردو بازار ۰ لاہور

[redacted] 00

مولانا محمد علی مظفری نوراللہ مرقدہ

— کے نام —

فہرست

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

صبر و توکّل

دسواں باب

عورت کا مقام

گیارہواں باب

بارہواں باب

حرفِ آغاز

معلوم نہیں میرے بھائی صدیق احمد صدیقی کو کیا سوجھی کہ انہوں نے ترجمان القرآن کے متعدد شماروں میں بکھرے ہوئے اشارات کو یکجا کر کے میرے سامنے رکھ دیا۔ میں ان اوراقِ پریشاں کی اشاعت میں کافی متامل تھا اور ابھی اس امر کا جائزہ لے رہا تھا کہ کیا یہ کتابی صورت میں قابلِ اشاعت بھی ہیں یا نہیں اور اگر انتہائی حُسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے انہیں قابلِ اشاعت سمجھ ہی لیا جائے تو پھر کس اشاعتی ادارے کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے میں ابھی ان امور پر غور کر رہا تھا کہ ایک روز عزیزم عبد الحفیظ نے بھولے پن ہی اس مجموعہ کی افادیت اور اس کی نکاسی کا جائزہ لیے بغیر، اس کی اشاعت کی حامی بھر لی۔ میرے لیے یہ بات اس حد تک تو باعثِ اطمینان تھی کہ ایک نوجوان ناشر جس کے اندر دینی کام کرنے کا جذبہ اور اُمنگ ہے، ان اوراق کو شائع کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے، مگر مجھے یہ فکر برابر دامنگیر رہی کہ کہیں ان کی اشاعت سادہ دل ناشر کے لیے کسی مالی پریشانی کا موجب نہ بن جائے۔

چند الفاظ اس مجموعہ کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں گزشتہ چھتیس سال سے مُجلّہ ترجمان القرآن سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ چلا آ رہا ہوں۔ ابتدائی نو سال تو

محض ایک قاری کے طور پر اس کے بلند پایہ مضامین سے بھرپور استفادہ کرتا رہا۔ پھر دو تین سال تک بحیثیت مقالہ نگار اس کے لیے چند مقالات لکھے۔ اس کے بعد اس کے "اشارات" کی ذمہ داری مجھ جیسے نااہل اور علم و عمل سے بے بہرہ شخص پر ڈال دی گئی۔

ہر شخص جو کچھ بھی مذہبی احساس رکھتا ہے اس کی زندگی میں بعض لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب اس کا دل خوفِ خدا سے کانپ اٹھتا ہے۔ مجھ پر بھی ڈر اور خوف کی یہ کیفیت کئی مرتبہ طاری ہوئی، لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر خوف مجھے جماعتِ اسلامی کی رکنیت کا حلف اٹھاتے ہوئے اور ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے ہوا کسی دوسرے موقع پر لاحق نہیں ہوا، اور ان دو مواقع پر میری آنکھوں کے سامنے اس پہاڑ کی بے بسی اور اس کی کپکپاہٹ کا نقشہ گھومنے لگا جسے قرآن مجید کا بوجھ اٹھانے کے لیے کہا گیا تھا۔ بے چارگی کی ان کیفیات میں مجھے خوف اور خشیت میں جو لطیف فرق ہے اس کا بھی ادراک ہوا۔

حلفِ رکنیت کا خوف اب بھی تنہائی کے لمحات میں مجھے اکثر بے چین کرتا ہے اور میں یہ سوچ کر سخت پریشان ہوتا ہوں کہ جو مقدس عہد میں نے اپنے مالک سے باندھا تھا اسے نبھانے میں بالکل ناکام رہا ہوں۔ لیکن خدا کی رحمت کا تصور جب سامنے آتا ہے، تو اضطراب کسی حد تک سکون میں بدل جاتا ہے۔ ترجمان القرآن کے سلسلے میں خوف کی کیفیت یکسر دوسری ہے۔ ہر ماہ اشارات لکھتے وقت یہ خوف میرے دل و دماغ پر مستول ہو جاتا ہے کہ کہیں میرے قلم سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس سے دین کو نقصان پہنچے اور اجر حاصل کرتے کرتے اپنا اعمال نامہ جو پہلے ہی کافی حد تک سیاہ ہے مزید سیاہ نہ کر لوں۔ دوسرے میرے اندر یہ چبھتا ہوا احساس شروع دن سے ہی موجود رہا ہے کہ میں کسی لحاظ سے بھی اس عظیم کام کا اہل نہیں ہوں۔ اس کام کے لیے اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسی جامع کمالات شخصیت ملنی ناممکن ہے تو بر سبیلِ تنزّل ایسا شخص تو ضرور تلاش کرنا چاہیئے جو علمِ دین میں

رسوخ اور تحریکِ اسلامی، اس کے مزاج اور اس کے معاملات میں گہری بصیرت رکھتا ہو تاکہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں اس تحریک کی رہنمائی کر سکے۔ اِس نقطۂ نظر سے جب اپنا جائزہ لیتا ہوں تو کسی بے جا انکسار کے بغیر بطورِ حقیقت اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جو نازک کام میرے سپرد کیا گیا ہے میں اس کے لیے بالکل غیر موزوں ہوں۔ دینی بصیرت تو خیر بڑی چیز ہے، جس شخص کی سرے سے کوئی محسوس دینی معلومات ہی نہ ہوں، وہ اس نازک کام کو، اس کی حقیقی ذمہ داریوں کے ساتھ، آخر کس طرح سر انجام دے سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کام کے بوجھ سے دب کر نہیں بلکہ اپنی علمی بے بضاعتی کے خوف سے میں اس مجلّہ کے ناظمین سے بارہا گزارش کر چکا ہوں کہ اگرچہ اس ادارہ کے ساتھ وابستگی کو میں اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں لیکن اشارات لکھنے کی بھاری ذمہ داری کسی بالغ نظر عالمِ دین کے سپرد ہونی چاہیئے۔ میرے ان کرم فرماؤں نے میری معروضات کو ہمیشہ ہمدردی کے ساتھ سنا، مگر مجھ سے کسی حد تک اتفاق کرنے کے باوجود یہ کام جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ میں یہ کام اپنی خامیوں کے اعتراف اور اپنی علمی کم مائیگی کے احساس کے باوجود اور کسی اہل تر آدمی کے میسّر آجانے کی امید پر رُبع صدی سے کرتا چلا آرہا ہوں۔ اس عرصہ میں مجھ سے بے شمار کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں، غفور و رحیم ذات انہیں معاف فرمائے۔

گزشتہ پچیس سالوں پر پھیلے ہوئے یہ اشارات جو مختلف موضوعات پر مختلف اوقات، مختلف حالات اور مختلف تاثرات و کیفیات کے تحت لکھے گئے تھے ان میں کوئی معنوی ربط تلاش کرنا سعئِ لاحاصل ہے۔ میرے بھائی صدیق صاحب نے بڑی دیدہ وری سے کام لیتے ہوئے ان میں ایک مقصدی ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس معاملہ میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ فاضل قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

ان اشارات کا مرکزی موضوع ایک ہی ہے اور وہ ہے انسان کا روحانی اور اخلاقی احساس۔ یہی وہ احساس ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممیّز و ممتاز کرتا ہے۔

اگر انسان اس مقدس احساس سے محروم ہو جائے تو اس کی زندگی چوپایوں اور درندوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اسی احساس کی بنیاد پر انسان کو ایک محدود دائرہ میں فکر و عمل کی آزادی عطا ہوئی ہے۔ اس کے اندر صحیح و غلط، نیک و بد، محمود و مذموم کے مابین امتیاز کرنے کی صلاحیت ابھری ہے۔ اور ان امتیازی اوصاف کی وجہ سے ہی وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ٹھہرا ہے۔ جس طرح کسی چیز کو اس کے سایے سے، بشرطیکہ ہر سُو تاریکی نہ چھائی ہو، الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح انسان اپنے روحانی احساس سے قطعاً الگ نہیں ہو سکتا۔ اِلّا یہ کہ فکر و عمل کی گمراہیوں نے اس کے ضمیر کو بالکل مُردہ کر دیا ہو۔ انسان کا یہ رُوحانی احساس ایک لَو کی طرح اس کے باطن میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جو اس کی زندگی کے ہر گوشے کو مُنوّر کرتا ہے۔ دینِ حقّ اِس احساس کو زندہ رکھنے اور اسے جِلا دینے کا سب سے مؤثّر ذریعہ ہے۔ انسانی وجود کے لیے جو اہمیت ہَوا اور پانی کو حاصل ہے، اس سے کہیں زیادہ اہمیت روحانی احساس اور اسے برقرار رکھنے والی اور بڑھانے والی الہامی قوت کی ہے جسے بالعموم مذہب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو اس کے سارے اعضا و جوارح ٹھیک کام کرتے ہیں اور اگر اس میں فساد آ جائے تو انسان کا پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے چُنانچہ رُوحانی احساس کے اس مرکز کی اصلاح انسان کی بنیادی ضرورت ہے کیونکہ اس کی اصلاح ہی پر فرد اور معاشرے کی اصلاح کا سارا دار و مدار ہے۔ ظاہر بات ہے قلب کی اصلاح اُسی صورت میں سود مند اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے جب وہ ان سارے رشتوں کی اصلاح میں مؤثّر کردار ادا کرے، جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان، انسان اور انسان کے درمیان اور انسان اور کائنات کے درمیان قائم ہوتے ہیں۔ اس مجموعہ میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ انسان جب اپنے رُوحانی احساس کی آبیاری تعلیماتِ الٰہیہ سے کرتا ہے تو وہ کس صورت میں اور کن صفات و خصوصیات کے ساتھ برومند ہوتا ہے اور حیاتِ انسانی پر کس قسم کے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس مجموعہ میں اگر کوئی چیز مفید ہے تو محض اللہ کا فضل ہے اور اس میں جس قدر خامیاں اور نقائص ہیں، اُن کی وجہ میری کم فہمی اور کم علمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میری یہ دعا ہے کہ قارئین کو اِس کی غلطیوں سے محفوظ رکھے اور اس کی صحیح باتوں کو قبول کرنے کی توفیق دے اور اس طرح میری اس حقیر کوشش کو میرے لیے توشۂ آخرت بنائے۔

میں مخدوم و محترم مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے اس ناچیز خادم کی ہر قدم پر بڑی شفقت کے ساتھ رہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ میں ادارہ ترجمان القرآن کے ناظم جناب حسین فاروق مودودی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان اشارات کو مجموعہ کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔

اس مجموعہ کی تدوین و ترتیب کا زیادہ تر بوجھ اگرچہ بھائی صدیق احمد صاحب نے اٹھایا ہے، لیکن اس پر نظرِ ثانی میرے فاضل دوست جناب محمد طفیل ضیغم اور میرے بھائی محمد اقبال شائق نے کی ہے۔ چوہدری محمد بشیر صاحب رُکن ادارہ ترجمان القرآن نے اِس کی طباعت اور اشاعت کے سلسلے میں تعاون کیا ہے اور میرے دوست بشیر احمد صاحب نے بہت سے دوسرے امور میں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے۔

عفو و مغفرت کا طالب،
عبدالحمید صدیقی،

طابع ———— عبدالحفیظ احمد

ناشر ———— البدر پبلی کیشنز

۴۰۔بی اردو بازار لاہور

مطبع ———— اللہ والا پرنٹرز ۱۸ شاہراہ قائد اعظم لاہور

قیمت :۔

پہلا باب

ڈاروِن کی خام خیالیاں

تاریخ کے نامعلوم دور سے لے کر آج تک یہ سوالات ہر دور کے انسان کے سامنے رہے ہیں کہ یہ کائنات کیا ہے اور کس طرح وجود میں آئی ہے۔ بلکہ خود انسان کس طرح پیدا ہوا ہے اور اس کا انجام کیا ہونا چاہیئے۔ کائنات میں موجود اشیاء کا باہمی رشتہ کیا ہے اور ان اشیاء سے انسان کا تعلق کیا ہے، نیز اس تعلق کے تقاضے کیا ہیں۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ہر دور کا انسان غور و فکر میں مصروف رہا ہے اور ہر دور نے ان سوالات کے جوابات کے لیے ایک مکمل فلسفۂ حیات وضع کیا ہے جس کے نتیجے میں مختلف نظام ہائے زندگی ظہور میں آتے ہیں۔ ہمارے موجودہ دور میں بھی زندگی کے مختلف فلسفے اور نظام موجود ہیں اور ان میں اعتقاد رکھنے والے اپنے مخصوص طرزِ زندگی کو صحیح اور بہتر ثابت کرنے میں کوشاں ہیں۔ لیکن اگر ان سب موجود نظاموں اور فلسفوں کا جائزہ لیا جائے تو صرف دو بنیادی نظریے سامنے آتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات ایک علیم و خبیر حکیم و مدبّر اور قادر و عادل ہستی نے پیدا کی ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں اور وہ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا سارا انتظام خود چلا رہا ہے اور جب چاہے گا اس کو لپیٹ کر رکھ دے گا اور انسان کو عطا کردہ شعور و اختیار کے مطابق باز پرس کرے گا۔ اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات محض بخت و اتفاق سے وجود میں آگئی ہے اس میں کسی خالق ہستی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے لہٰذا جزا اور سزا کا تصوّر بے معنی ہے۔ حیات و موت اور زندگی میں ترقی وغیرہ کے لیے تنازع للبقاء کا اصول کارفرما ہے یعنی ہر بہتر زندہ رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے اور ہر کمزور ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں نظریوں میں بعد المشرقین ہے۔ دونوں میں بنیادی اختلاف ہے،

ایک نظریے کے مطابق اس کائنات کے ساتھ انسان کے تعلقات کی جو نوعیت ہونی چاہیئے دوسرے نظریے کے مطابق وہ بالکل غلط ہوتی ہے، کیونکہ دونوں نظریات اس کائنات کی ہر شے سے انسانی تعلقات کی جو نوعیت پیش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کے اُلٹ ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ دونوں نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں — خدا کی ہستی کے قائل اہلِ مذہب کہلاتے ہیں اور ایسا نہ ماننے والے کو لوگ ملحد کہتے ہیں لیکن وہ خود اپنے لیے اہلِ خرد کا نام پسند کرتے ہیں۔

دوسرے گروہ کا جو نظریہ اس وقت دنیا میں مشہور اور رائج ہے اسے ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء اور نظریۂ تنازع للبقاء بھی کہا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داری، آمریت، سوشلزم، اشتمالیت اور اشتراکیت کے فلسفہ ہائے زندگی کی اصل بنیاد یہی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں کسی ایسی ہستی کا کوئی دخل نہیں جسے لوگ خدا اور اللہ کہہ کر پکارتے ہیں بلکہ یہ سارا کھیل مادہ کے خواص اور بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے۔

ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء

ڈاروِن نے اگرچہ اپنے فلسفہ میں اصل گفتگو "ارتقاء" کے متعلق کی ہے لیکن اسے اس نہج پر اٹھایا گیا ہے، کہ خالقِ کائنات اپنی اس کائنات سے خود بخود بے تعلق نظر آتا ہے۔ ایک قاری کو اس فلسفہ میں اگرچہ حیرت انگیز جدت اور نیاپن محسوس ہوتا ہے لیکن جس کی نگاہ اسی طرز کے دوسرے لٹریچر پر بھی ہے، وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ ڈاروِن کو اس عہد میں جو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے خیالات و افکار میں اپنے پیشرؤں کے مقابلے میں زیادہ ندرت تھی بلکہ اس شہرت کے اسباب کچھ دوسرے ہیں۔

ڈاروِن کے "نظریۂ ارتقاء" کی مقبولیت کی اصل وجہ

یورپ میں عقلیت پرستی نے جنم لیا تو اہلِ کلیسا نے اس تحریک کو کسی صحیح راہ پر ڈالنے کی بجائے اس کی اندھا دھند مخالفت

شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اہلِ مذہب" اور "اہلِ خرد" دو مخالف اور متحارب گروہوں میں بٹ گئے اور ان دونوں میں بدقسمتی سے ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر تبدیلی کے جذبات خالص الحاد کی راہ پر بہہ نکلے، اس قسم کی تلاطم خیز فضا میں جب لوگوں کے فکری جہاز بالکل بے لنگر ہو چکے ہوں، اس بات کی توقع کرنا کہ لوگ افکار و نظریات کی صحت یا عدمِ صحت کا فیصلہ جذبات کی شعلہ فشانیوں کی بجائے فہم و فراست کی معتدل میزان پر تول کر کریں گے، بالکل عبث اور بے کار ہے۔ ان حالات میں ہیجانات ہی لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور انہی نظریات کو قبول عام نصیب ہوتا ہے جو عوام کے دل پسند رجحانات سے ہم آہنگ ہوں، ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی شہرت کے پس پردہ بھی یہی چیز کار فرما ہے، اس تحریکِ الحاد میں چونکہ زندگی کی عمارت اس بنیاد پر تعمیر کرنا مقصود تھی کہ اس کائنات میں اصل صرف مادہ ہے، اس لیے مفکرین نے اس قسم کے فلسفے گھڑنے شروع کیے جن کی رو سے نمو، حرکتِ ارادی، احساس و شعور اور فکر سب اسی مادہ کے خواص قرار پائے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبیعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں، ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں، اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی ارادہ نہیں اور اس سے بڑھ کر یہ پوری کائنات کسی خالق کے تدبر کا نتیجہ نہیں بلکہ محض بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی ہے۔ اس کائنات کا نظام ایک اندھی بہری قوت کے ہاتھ میں ہے جسے لوگ "لزوم" کہتے ہیں۔ اس نظام میں کسی الہامی ہدایت کی ضرورت نہیں، یہاں کسی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق کے لیے گنجائش نہیں۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء چونکہ ان سب تصورات کے لیے ایک فکری بنیاد فراہم کرتا ہے، اس لیے لوگوں نے اسے اپنے دل کی ایک فطری پکار سمجھتے ہوئے نہ صرف اسے فوراً قبول کیا بلکہ والہانہ انداز سے اس کا خیر مقدم کیا گویا کہ وہ اس کے لیے پہلے سے سراپا انتظار تھے اور اس تاک میں تھے کہ کوئی اٹھے اور انہیں ایک ایسا

عملی مفروضہ (WORKING HYPOTHESIS) مہیا کرے جس کی مدد سے وہ اپنے فلسفہ الحاد کی پوری عمارت بآسانی تعمیر کر سکیں۔ مشہور سائنس دان ایکس ہل (UEXHULL) اس نظریہ کی مقبولیت کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

”ڈارونیت سائنس سے زیادہ ایک مذہب ہے۔ یہ نظریہ جن حقائق پر مبنی ہے اُن میں وہ منطقی ربط مفقود ہے جو حقیقتاً سائنس کی جان ہوتا ہے لیکن چونکہ اس میں بعض چیزیں لوگوں کی دل پسند ہیں اس لیے متعدد علمی لغزشوں کی نشاندہی کے باوجود لوگ اس نظریے پر فریفتہ ہو گئے۔ یہ نظریہ نام ہے ایک ایسے عزم صمیم کا جس کے پیش نظر کائنات سے نظم و ضبط کے اصول کو مٹانا ہے۔ اس طریق سے ارتقاء کا نظریہ ہزاروں لوگوں کا ایک مقدس عقیدہ بن گیا ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جس کا سائنس کی غیر جانبدارانہ تحقیق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ ارتقاء کی توجیہہ تخلیق کے باطن میں کسی حکیم کے ارادے اور حکمت کو تسلیم یا فرض کیے بغیر کی جا سکتی ہے۔“

ڈارون کے پیش رو

آیئے اب ایک نظر یہ دیکھیں کہ ڈارون سے پہلے کن کن اصحاب فکر نے اس نظریہ کو پیش کیا۔

ارتقاء کے لفظ کو اگر انواع کی تبدیلی کے ہم معنی سمجھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ کوئی جدید نہیں ہے۔ البتہ اس نظریئے نے جو سائنٹفک شکل اختیار کی ہے وہ ضرور جدید ہے اور اس کی تاریخ سترہویں صدی سے پیچھے نہیں جاتی۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے سائنٹفک حلقے بکثرت نظریۂ ارتقاء سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔

سموئیل بٹلر SAMUAL BUTLER نے اپنی کتاب ارتقاء قدیم و جدید EVOLUTION OLD AND NEW میں اس نظریئے کی جو تاریخ بیان کی ہے، اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ ڈاروِن سے پہلے بفون (BUFFON) ارامس ڈاروِن ERASMUS DARWIN (چارلس ڈاروِن کا دادا) اور لامارک LAMAREK اس نظریئے کو پیش کر چکے تھے۔ بٹلر کی رائے میں ڈاروِن کے بجائے بفون اس کا مستحق ہے کہ اس کو نظریۂ ارتقاء کا پہلا مکتشف قرار دیا جائے مگر خود بفون نے بھی اس تخیل کا استفادہ ڈے کارٹ DESCARTES اور لائبنٹز سے کیا تھا۔

بفون ۱۷۰۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۸۸ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد ڈاروِن کے دادا ارامس (۱۷۳۱ - ۱۸۰۲ء) نے بفون کے نظریئے کو اور زیادہ ترقی دی بفون کی رائے یہ تھی کہ ارتقاء نتیجہ ہے حیوان اور اس کے ماحول کے درمیان تعامل کا۔ ماحول نئی نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اور ان ضرورتوں کو مہیا کرنے کے لیے حیوان کی کوششیں اس کے اندر نئی عادتیں پیدا کرتی ہیں اور یہ نئی عادتیں جسم میں تغیّر اور نئے آلات کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں۔

مشہور فرانسیسی نیچری لامارک (۱۷۴۴ - ۱۸۲۹ء) نے بڑی تفصیل کے ساتھ ارتقاء کے اس نظریئے کو بیان کیا۔ اُس کا خیال یہ ہے کہ جن اعضاء کو استعمال کرنے کے زیادہ مواقع پیش آتے ہیں، وہ ترقی کرتے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جنہیں استعمال کے مواقع کم پیش آتے ہیں وہ گھٹتے اور رفتہ رفتہ غائب ہو جاتے ہیں۔

ڈاروِن کی فکری اساس

چارلس ڈاروِن جسے شہرۂ آفاق نظریۂ ارتقاء کے مکتشف ہونے کا ادّعا ہے وہ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے دادا کے نظریات پڑھے تھے اور ارتقا کا مسئلہ اس کی خاندانی چیز تھا۔ لیکن اسے جس چیز نے ایک "ارتقائی" بنایا وہ مالتھس کے نظریات اور خود اس کے اپنے اکتشافی سفر تھے۔ جو اس نے ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۶ء کے دوران میں ایشیائی جزیروں، جنوبی امریکہ کے ساحلوں، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، مارشس، برازیل میں

کیے۔ اس سیاحت سے وہ بہت کچھ مواد لے کر آیا اور اس کا ایک خاص ترتیب کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔ ۱۸۳۸ء میں اس نے مالتھس کا آبادی پر مقالہ پڑھا اور یہاں سے اس کو تنازع للبقا کے نظریئے کا سراغ ملا۔

مالتھس جو خاندان کے اعتبار سے ایک پادری تھا، یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی نسل اس تیزی سے بڑھتی ہے کہ وسائل معیشت اس کی ترقی اور تکثر کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ڈارون نے اس پر یہ استدلال کیا کہ انسان سے بہت زیادہ تیزی کے ساتھ حیوانات اور نباتات کی نسل بڑھتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حیوانات اور نباتات کی تعداد سال بسال بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، لامحالہ کوئی ایسی قوت ضرور ہونی چاہیئے۔ جو ان کی تعداد کو ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد بڑھنے سے روک دیتی ہو ورنہ روئے زمین سال دو سال ہی میں انواع حیوانات سے بھر جائے گی، یہ مامور دافع ELIMINATING AGENT ڈارون کی رائے میں تنازع للبقا ہے اور یہیں سے مشہور نظریہ انتخاب طبیعی NATURAL SELECTION کا بھی سراغ ملتا ہے۔

ڈارون کی کتاب "اصل الانواع" ORIGIN OF SPECIES کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں تھوڑا بہت اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اگرچہ فرداً فرداً محض خفیف سے ہوتے ہیں، مگر پھر بھی حقیقی ہوتے ہیں اور انہیں افراد کے بقا میں پوری پوری مداخلت حاصل ہوتی ہے۔ بعض افراد ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور انہیں دشمن سے بھاگ جانے کا زیادہ موقع ملتا ہے، بعض دوسرے افراد سردی سے بچنے کا زیادہ سامان رکھتے ہیں اور غیر معمولی سردی میں زندہ رہنے کے زیادہ مواقع انہیں حاصل ہوتے

ہیں۔ان مشاق افراد کی نسل وراثت میں ان وسائل بقاء کا تحفظ پاتی ہے اور اس طرح اسے تنازع للبقاءمیں کامیابی کے ساتھ دوسرے افراد سے مقابلہ کرنے کا موقع فراہم ہوجاتا ہے ہر پشت میں وہ افراد جو بقاء کی کم تر قابلیت رکھتے ہیں زیادہ تیزی سے مرجاتے ہیں اوران کی نسل کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ اور بخلاف اس کے جو ان کے مقابلے میں صالح تر افراد ہیں وہ زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں اور زیادہ کثیر نسل چھوڑ جاتے ہیں ہر پشت میں افراد کی ایک محدود تعداد افزائش نسل سے بچ جاتی ہے اور جو افراد بچ جاتے ہیں، ان کے ذریعے وہ مخصوص امتیازی خوبیاں جاری رہتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں تنازع للبقاء میں کامیابی کا موقع میسر آتا ہے۔"

ڈارون اپنے اس نظریہ کو زرافہ کی مثال سے واضح کرتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ قحط اور خشک سالی کے زمانے میں سبزی کھانے والے جانوروں میں جو جانور زیادہ لمبی گردن رکھتے ہیں ان کو کوتاہ گردن والے جانوروں کی بہ نسبت اونچے درختوں کی شاخوں تک پہنچنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اور اس لیے وہ زندہ رہنے کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں، پہلی قسم کے جانور بقاء اور تناسل میں کامیاب ہوتے ہیں اور چھوٹی گردن والے جانور ہلاک ہوجاتے ہیں ہر پشت میں یہ عمل جاری رہتا ہے اور گردن کی طوالت ہر پشت میں بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ یہ وجہ زرافہ کو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

ڈارون کے برعکس لامارک زرافہ کی گردن کو "استعمال" اور "کوشش" کا نتیجہ قرار دیتا ہے، جس طرح لوہار کا بازو استعمال سے نمو پاتا اور قوی ہوتا ہے، اسی طرح جانور نے گردن کو ابھار ابھار کے پتے کھانے کی کوشش کی۔ اس کی گردن بڑھتے بڑھتے لمبی ہوتی چلی گئی۔

لامارک اور ڈاروِن میں فرق یہ ہے کہ لامارک کی رائے میں زیادہ ہوشیار اور

زیادہ کوشش کرنے والا زرافہ خود اپنا انتخاب کرتا ہے اور اپنی کوشش کا صلہ بقا کی صورت میں پاتا ہے بخلاف اس کے ڈاروِن کے نزدیک انتخاب طبیعی ہر لحاظ سے اندھا دھند ان زرافوں کا انتخاب کرتا ہے جو اپنی کوشش کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ اتفاقاً زیادہ لمبی گردن سے سرفراز ہوئے ہیں۔

یہ ہے مختصر طور پر وہ نظریہ ارتقا جو جدید تہذیب و تمدن کی فکری اساس ہے۔
اب ہم نہایت ہی اختصار سے ان اعتراضات کو پیش کرتے ہیں جو ڈاروِن کے اس نظریہ پر مختلف حکماء اور اہلِ فکر نے پیش کیے۔

سموئیل ٹیلر اس نظریہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر تمام عالم میں نہایت نازک اور حکیمانہ خلقتوں کا ضرورت اور محل کے مناسبِ حال بننا اور ڈھل جانا محض اتفاقی طور پر مناسبِ حال اسباب کے جمع ہونے کا نتیجہ ہے تو پھر یہ بھی مان لینا چاہیئے کہ اسٹیم انجن کی ایجاد بھی صرف انسان کی اتفاقی کوششوں کا ثمرہ ہے، انسان اس چیز کا قطعاً ضرورت مند تھا لیکن جب بھاپ کا دیو اتفاق سے معرضِ وجود میں آگیا تو پھر انسان نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

دوسرے اگر انتخاب طبیعی ہی مختلف انواع کی بقا کا ضامن ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر لمبی گردن والے جانور کم کیوں ہیں۔ جس طرح زرافہ اس چیز کا محتاج ہے کہ وہ اونچے درختوں تک رسائی حاصل کرے، اسی طرح وہ سارے جانور، جو درختوں کے پتے کھاتے ہیں، وہ بھی اس بات کے حاجتمند ہیں کہ ان کی گردنیں لمبی ہوں۔ یہ ضرورت تو بے شمار جانوروں کو لاحق ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے جانوروں کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہیئے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، اس اعتراض کا کوئی جواب نہ ڈاروِن دے سکا اور نہ لامارک۔ ڈاروِن خود اعتراف کرتا ہے۔

"میرے لیے اس حقیقت کو سمجھنا بہت مشکل ہے کہ وہ لمبی گردن جو

زرافہ کے حق میں اتنی مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے اسے بقاء نصیب ہوئی ہے ۔ وہ اسی نوع کے دوسرے جانوروں کو کیوں نصیب نہیں ہوتی ؟"

اگر ڈاروِن کا نظریہ صحیح اور درست ہے تو یہ توقع کرنا ہر گز خلافِ عقل نہیں ہے کہ ایسے ہی زرافہ کی مانند گردنیں رکھنے والے جانور دنیا کے تمام قطعات میں پیدا ہونے چاہئیں ۔ اگر انتخابِ طبیعی کا عمل واقعی دنیا میں جاری ہے تو اسے عالمگیر ہونا چاہیئے اور اس میں یکسانیت پائی جانی چاہیئے ۔

اب ذرا اسی معاملہ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھئے ۔

کوئی شخص اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ خلقت کی ابتدا زیادہ سادہ چیزوں سے ہوئی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ صورتیں رونما ہوئی ہیں ۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ زمین پر نباتات پہلے پیدا ہوئے، پھر حیوانات کی نوبت آئی پھر انسان کی ۔ مگر یہ ارتقاء لازماً تناسلی ارتقاء نہیں ہے ۔ اور تقدم و تاخر زمانی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ متاخر شے متقدم سے بطریقِ تناسل پیدا ہوئی ہے ۔ پہلے چپوؤں سے چلنے والی کشتیاں تھیں، پھر ان کے چلانے کے لیے بادبانوں کو استعمال کیا جانے لگا اور اب انسان کی قوّتِ تخلیق نے انہیں بھاپ کی قوّت سے چلانا سیکھا ہے ۔ یہ سب کچھ یقیناً ایک ارتقاء ۔ اور ترقی ہے لیکن اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ سٹیم سے چلنے والے جہاز پرانی کشتیوں کی نسل سے ہیں ہمیں توارث یا وراثت اور اصل و ذریت DESCENT کے فرق کو ضرور ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے ۔ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب تخت نشین ہوا ۔ وہ جانشین بھی تھا اور اس کی نسل سے بھی تھا ۔ علاؤ الدین خلجی کے بعد غیاث الدین ہندوستان کا بادشاہ ہوا ۔ وہ اس کا جانشین و خلف تھا مگر اس کی نسل سے نہ تھا ۔

اسی طرح اس حقیقت سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جو شے باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتی وہ ہلاک ہو جاتی ہے اور جو اصلح ہے وہی الںقیٰ ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی دریافت کا سہرا ڈاروِن کے سر ہو۔ ہر شخص یہ بات شب و روز کے مشاہدے اور تجربے سے جانتا ہے۔ البتہ جو چیز نئی ہے اور جس کا دعوےٰ ڈاروِن نے کیا ہے وہ یہ مسلّم صداقت نہیں ہے کہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھنے والا زندہ رہتا ہے بلکہ یہ ہے کہ بقاء اصلح ہی انواع کے تغیّر و تبدل میں آخری اور فیصلہ کن قوّت ہے۔ اگر ہم اس خیال کو مان لیں تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ انتخابِ طبعی کا پورا عمل ایک بگے بندھے ضابطے کے مطابق ہو رہا ہے اور اس کے پیچھے ایک گہری حکمت اور دانائی موجود ہے، جو دنیا کے سارے تغیرات کے پیچھے کارفرما ہے۔ ڈاروِن کے نظریہ میں یہ تضاد بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ایک طرف تو وہ اصول پیش کرتا ہے کہ اصلح ہی الںقیٰ ہے مگر دوسری طرف وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ انواع کی تبدیلی سب کچھ بخت و اتفاق سے ہو رہی ہے۔ ڈاروِن اپنے فکر کی بنیاد کے لیے صرف حیوانات اور نباتات کو لیتا ہے، مگر اس کا یہ اندازِ فکر صحیح نہیں۔ سائنس کے اصولوں کی ایک بنیادی صفت اُن کی ہمہ گیری ہے۔ ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء اسی صورت میں صحیح اور درست مانا جا سکتا ہے اگر وہ کائنات کے ہر نوعی تغیّر کی وجہ اور علّت کی صحیح صحیح نشاندہی کرے۔ ڈاروِن یہ تو بتاتا ہے کہ حیوانوں نے کس طرح دھیرے دھیرے بالکل تدریجی طور پر نہایت ہی خفیف تغیّرات کے جمع ہوتے رہنے سے انسانوں کا روپ دھار لیا ہے اور اس طرح ایک نئی نوع وجود میں آگئی مگر وہ اس کائنات کی ابتدائی کڑیوں سے کچھ بحث نہیں کرتا۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ دنیا میں جو غیر معیّن توانائی موجود تھی اس کے بطن سے معین مظاہر کیسے پیدا ہو گئے۔ اگر کائنات کا یہ سارا کارخانہ بے مقصد اور بے ارادہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے چل رہا ہے تو پھر فکری دلیل حیران و ششدر رہے کہ اس بے منصوبہ

عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہو گئی۔ ارتقاء کے میکانکی اور اندھے لزوم سے شعور و ذہن کیسے معرضِ وجود میں آ گئے۔ معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ انسان کا دل بے تاب شعور کی اگلی منزلیں جو سلسلۂ ارتقاء میں مضمر ہیں، ان کی کنہ معلوم کرنے کے لیے بھی مضطرب رہتا ہے مگر ڈارون اور اس کے ہم خیال اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔

۳۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انتخابِ طبیعی چھوٹے چھوٹے تغیرات کے تدریجی اور آہستہ آہستہ اجتماع کے ذریعہ عمل کرتا ہے تو پھر دنیا کو دو نوعوں کے درمیان تحویل پذیر TRANSITIONAL صورتوں کے جانوروں سے لبریز ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ساری دنیا میں متعین اور مقرر صورتوں کی انواع دیکھتے ہیں۔ پانچ ہزار برس کا تاریخی ریکارڈ اس بات کا شاہد ہے کہ جس شکل و صورت کے جانور آج سے ہزاروں برس پہلے تھے ویسے ہی آج تک ہیں اور کبھی کوئی ایسا جانور نہیں دیکھا گیا جو دونوں کے درمیان عبوری صورت میں ہو۔ یہ اعتراض ایسا ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ انتخابِ طبیعی ان خفیف تبدیلیوں کی اصل اور ان کے استمرار کی کوئی توجیہہ نہیں کر سکتا جو اپنے مرحلہ اساس ہیئت RUDIMENTARY STAGE میں کچھ مفید نہیں ہوتیں۔ جب انتخابِ طبیعی کے ذریعہ ایک نوع دوسری نوع کا روپ دھارتی ہے تو اس تبدیلی کے مابین بہت سے پرانے اعضاء غیر مفید اور بے کار ہو کر خود بخود فنا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اعضاء جو ایک بالکل نئی نوع کی بقاء کی ضمانت ہوتے ہیں خود بخود معرضِ وجود میں آتے ہیں لیکن یہاں ایک عجیب و غریب پیچیدگی سامنے آتی ہے ظاہر بات ہے کہ نئے اعضاء فوراً کام کرنا شروع نہیں کر دیتے۔ ان کے مفید اور کار آمد ثابت ہونے سے پیشتر انہیں بہت ہی پرپیچ مراحل سے گزرنا پڑتا

ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان درمیانی منازل کی افادیت آخر کس کے حصّہ میں آتی ہے، نئی نوع کے یا پُرانی نوع کے، اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ کوئی نوع تغیّر کی جس منزل میں ہوگی اُسی مرتبہ کے اعتبار سے اعضاء اس کے کام آئیں گے۔ لیکن اس جواب سے ہماری اصل الجھن دُور نہیں ہوتی۔ اعضاء تبدیلی کے ہر مرحلہ میں مفید نہیں ہوتے بلکہ ارتقاء اور ترقی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر کسی افادیت کے حامل ہوتے ہیں، ان عبوری منزلوں میں آخر وہ کون سی قوتیں ہیں جو ایک نوع کو دوسری میں منتقل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں؟ تغیّر پذیر حالات میں تو ان میں اتنی قوت نہیں پیدا ہو سکتی کہ وہ اس عمل کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔ اس کے لیے انہیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے، جب وہ قوّت و طاقت کے ایک خاص معیار تک پہنچ جائیں۔ پھر انتخاب طبیعی سے نہایت پیچیدہ اعضاء مثلاً آنکھ کے ارتقاء کی توجیہہ نہیں ہو سکتی جو بہت سے اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایسے اجزاء اس وقت تک کام نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہایت صحت اور باریکی کے ساتھ وضع نہ کیے جائیں۔

۵۔ ڈاروِن کا اعتقاد ہے کہ ارتقاء نتیجہ ہے تنازع للبقاء کا، اور یہ کہ انواع کا تحویل (تبدیلیِ ہیئت یا تحویلِ جسم) اس جگہ بہت نمایاں ہوگا جہاں تنازع للبقاء زیادہ سخت ہوگا۔ لیکن اعداد و شمار ڈاروِن کے اس نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔ ایک روسی ماہرِ نباتات نے ایک لمبے تجربے اور گہرے مشاہدے کی بنا پر ڈاروِن کے اس خیال کو یکسر باطل ٹھہرایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نئی انواع ان جگہوں پر جلدی اور آسانی کے ساتھ معرضِ وجود میں آتی اور ترقی کرتی ہیں جہاں تنازع للبقاء کا عمل بہت کمزور ہوتا ہے۔ یہ عمل تو بجائے نئی انواع کی تخلیق کرنے کے اُن کے تغیّر کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے اور یہ کسی صورت میں بھی ان نوعی تغیّرات کے لیے مفید اور کار آمد ثابت نہیں ہوتا۔

نظریۂ ارتقاء کا تنقیدی جائزہ

ایک انسان جب ڈاردن کے نظریہ ارتقاء کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے تو اس کے ذہن میں فوراً یہ سوال ابھرتا ہے کہ جب اس میں اس قدر اسقام پائے جاتے ہیں تو وکٹورین عہد کے اہلِ سائنس نے ایسے خام نظریئے کی والہانہ انداز میں پذیرائی کیوں کی؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ایمان باللہ کے خلاف اس عہد میں جو تعصب پھیلا ہوا تھا وہی اس کی مقبولیت کا سبب بنا۔ پالی PALEY نے مشاہداتِ فطرت سے خدا کی ہستی پر جو استدلال کیا تھا اور تخلیق کے وجود سے خالق کے وجود پر جو دلائل پیش کیے تھے وہ ایسے قوی تھے کہ دہریوں کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا، ڈارون نے آگے بڑھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ قدرت کے اس کارخانہ میں جو انتظام و انصرام یا جو منصوبہ بندی نظر آتی ہے یہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے، یہ جواب خواہ کتنا ہی کمزور ہو مگر چونکہ سائنٹیفک طریق استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اس لیے بعض سائنس والوں نے اسے فوراً قبول کر لیا اور ایسے جذباتی انداز میں اس کا پرچار کیا کہ خدا پر اعتقاد متزلزل ہونے لگا۔ بالغ النظر سائنس دان اگرچہ ڈارون کے اس نظریئے کو پوری طرح تسلیم نہ کرتے تھے اور اس میں بہت سے اسقام پاتے تھے مگر مذہب بیزاری THEOPHOBIA نے انہیں مجبور کیا کہ اس خام نظریئے ہی کا ڈھول پیٹیں، مثال کے طور پر ہکسلے کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ڈارون کے نظریئے کو پوری طرح نہیں مانتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے ڈارونیت کی زبردست حمایت محض اس بنا پر کی کہ یہ نظریہ ایک خالق کے وجود کے انکار کے لیے دلیل فراہم کر سکتا ہے، اس حقیقت کا اعتراف خود اس نظریئے کے بڑے بڑے حامیوں تک نے کیا ہے۔ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وائس مین WEISSMANN لکھتا ہے:

"کائنات کی تعبیر کے لیے ہم انتخابِ طبیعی کے اصول کو اس بنا پر

مانتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اصول ایسا نہیں جو اس کارخانۂ قدرت کی خالق کے اقرار کے بغیر کوئی دل لگتی تشریح کر سکے"

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ایک ایسا استدلال جو کسی طرح قابلِ اعتماد نہیں ہے صرف اس لیے قبول کر لینا چاہیئے کہ اگر ہم اس کو قبول نہ کریں تو ہمیں خدا کی ہستی اور اس کی صانعیت و ربوبیت ماننی پڑے گی۔

اسی طرح پروفیسر ڈی لیج DELAGE جو پیرس یونیورسٹی میں علم نباتات کا معلم ہے، ڈارون کے نظریئے پر بشدت نکتہ چینی کرتا ہے اور اُسے رد کر دیتا ہے، مگر آخر میں لکھتا ہے:

"ڈارون کی شہرتِ دوام کی اصل اور حقیقی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے ذی روح اشیاء کے جسمانی تغیّر و تبدّل کے ہوشربا عمل کو کسی مافوق الطبیعی ذات کی کرشمہ سازی کی بجائے خارجی عوامل کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔"

وقوعِ بلا علّت SPONTANEOUS GENERATION کا نظریہ جو ڈارون کے فکر کی جان ہے مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور اس امر کے اثبات پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکی کہ بیجان مادے سے زندگی خود بخود اُبھر آتی ہے لیکن خدا سے بیزار مادہ پرست اس کو بے دلیل مانتے چلے جاتے ہیں۔ والس مین مغرب کی اس ہٹ دھرمی کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"وقوعِ بلا علّت کو اگرچہ کوئی کوشش صحیح اور برحق تو ثابت نہیں کر سکی لیکن ہم اسے ایک منطقی ضرورت کے طور پر ماننے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔"

آخر سوچیے کہ یہ "منطقی ضرورت" کس قدر غیر منطقی ہے منطق کا ہر گز یہ مقتضیٰ نہیں کہ ہم تمام دلائل و شواہد سے قطع نظر کر کے ایک نتیجے کو صرف اس لیے مان لیں کہ ہم ایک خیالی مقدمے سے خواہ مخواہ محبّت رکھتے ہیں اور ہم نے اس مقدمے کو بغیر کسی معقول وجہ اور ثبوت

کے صحیح فرض کر لیا ہے۔ منطق کا اقتضاء تو یہ ہے کہ ہم کسی ایسے نتیجے کو تسلیم نہ کریں جس کے مقدمات ثابت شدہ نہ ہوں اور جس کے مقدمات کی صحت کا پوری طرح اطمینان نہ کر لیا گیا ہو۔ والٹس مین اور اس کی سی ذہنیت رکھنے والوں نے پہلے یہ مقدمہ فرض کر لیا ہے کہ خدا نہیں ہے مگر دوسری طرف اپنے سامنے جب ایک عالم کو موجود پایا تو ان دونوں مقدمات کی ترتیب سے یہ نتیجہ خواہ مخواہ اخذ کر لیا کہ عالم خود بخود پیدا ہوا ہے درآنحالیکہ "خدا نہیں ہے" کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور یہ مقدمہ خود محتاجِ دلیل ہے مگر یہ لوگ مصر ہیں کہ غلط نتیجہ کو ضرور مان لیا جائے۔ ان لوگوں کی عقل پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ یہ عالم کو ایک صانع حکیم کی تخلیق کا نتیجہ ماننے کے لیے تو تیار نہیں ہوتے مگر یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ یہ عالم ایک بے جان، بے روح، بے عقل مادے کے محض امتزاجی عمل کا نتیجہ ہے اور کسی مقصد و غایت کے بغیر خواہ مخواہ چل رہا ہے۔

اس نظریہ کو جن اسباب کی بنا پر ایک غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اُن میں بہت کچھ دخل پادریوں کے غیر دانشمندانہ رویہ کا بھی ہے۔ انہوں نے مذہب کو اس انداز سے پیش کیا کہ لوگوں کے اندر مذہب سے نفرت اور ایک ایسے عقیدہ کے لیے کشش پیدا ہو گئی جو مذہب اور اس کے معتقدات سے انحراف کے لیے انسانی ذہن کو تیار کرے۔ انگلستان کے مشہور طنز نگار برنارڈ شا اس نظریہ کی غیر معمولی مقبولیت کے وجوہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "ہمیں اس بات کا پوری طرح احساس ہونا چاہیئے کہ جب اس نظریہ کا غلغلہ بلند ہوا تو یورپ میں کس قسم کے مذہبی اعتقادات پائے جاتے تھے۔ خدا کے بارے میں ایک عام تصور یہ تھا کہ وہ ایک خوفناک قسم کا مطلق العنان بادشاہ ہے جس کی سیرت کا خمیر حسد، بغض اور کینہ کے عناصر سے اٹھایا گیا ہے، اسے انسانیت کو دُکھ پہنچانے میں گوناگوں لذت

محسوس ہوتی ہے۔ اس تصوّر کی موجودگی میں اہلِ کلیسا جسمانی تکلیف کے رفع کرنے کی مختلف تدابیر کو خداوند تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ میں دخل اندازی سمجھتے تھے، جب خالقِ کائنات کے متعلق کسی سوسائٹی میں اس قسم کے باطل اور گمراہ کُن نظریات موجود ہوں تو پھر اس سوسائٹی کا ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کو قبول کر لینا کوئی ایسی بات نہیں جو انسانی سمجھ میں نہ آسکے۔"

یہ سب حقائق اس بات پر شاہد ہیں کہ یورپ میں کچھ دلائل اور شواہد ایسے موجود نہ تھے جنہوں نے خدا سے بیزار مادہ پرستوں کو خدا کے انکار اور نظامِ عالم کی میکانکی توجیہہ پر آمادہ کیا ہو بلکہ یہ محض سطحی جذبات تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے خدا پرستی کے خلاف بھڑک اٹھے تھے اور انہوں نے اس بنا پر عالم کو خدا سے بے نیاز فرض کیا کہ وہ ایسا کرنا چاہتے تھے۔[1]

---

[1] تعصّب اور ضد کے زیرِ اثر آکر جذبات کا بہک جانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کی مثال تاریخِ انسانی میں نہ ملتی ہو۔ انفرادی زندگی میں تو ہم قدم قدم پر اس سے دوچار ہوتے ہیں اور جب اجتماعی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ایسی مثالوں کی کمی نہیں پاتے، دُور نہ جایئے اور دیکھئے کہ کیا اشتراکیت کو دولت مند اور سرمایہ دار طبقات کے خلاف اندھے غیظ و غضب نے جنم نہیں دیا جس طرح مذہبی طبقوں کے خلاف نفرت کا نتیجہ مادہ پرستی اور ڈاروینیت کی شکل میں رونما ہوا اسی طرح سرمایہ دار طبقوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر کمیونزم معرضِ وجود میں آیا عقلیت دونوں جگہ نہ تھی، پھر چونکہ مذہبیت اور سرمایہ داری نظام دونوں کے علمبردار یورپ میں باہم متحد تھے، بلکہ دونوں کا ایک ہی طبقہ تھا، اس لیے کمیونزم اور لامذہبی دونوں باہم متحد ہو گئے اور اس اتحاد کا کلّی ظہور روس میں ہوا، جہاں عہدِ زار کے نظامِ اجتماعی کے "نقشِ کہن" کو مٹانے کے لیے مذہب کو بھی تیاگ دینا لازمی اور ضروری سمجھا گیا۔ روس کا الحاد جن جذبات کے تحت ظہور پذیر ہوا، ان کو بخارین نے نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

مادہ پرست بڑے طمطراق سے کہتے ہیں کہ ہم کسی بات کو بغیر کافی شہادت اور مضبوط دلائل کے نہیں مان سکتے۔ چنانچہ ہکسلے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھتا ہے:

"ہمارے نزدیک ہر وہ دعوےٰ جس کی پشت پر شواہد نہ ہوں نہ صرف باطل ہے بلکہ ایک عظیم جرم بھی ہے۔"

مگر اس قسم کے معیار صرف دین اور دینی عقائد کو پرکھنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ رہی مادیت تو اس کو قبول کرنے کے لیے یہ عقلیت کے پرستار نہ تو کسی شہادت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی کسی دلیل کے طلبگار ہوتے ہیں۔

سائنس دانوں کا تعصّب

سائنس کے علمبردار اہل مذہب پر جو سب سے بڑا الزام لگا سکتے ہیں وہ تعصب، تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کا ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سائنس بھی اس الزام سے بری نہیں۔ اگر کوئی شخص اہلِ سائنس کے معتقدات کے خلاف اعتقاد رکھتا اور سائنس کے مسلّمہ نظریات کو نہ مانتا ہو، یا علانیہ روحانیت کا قائل ہو تو آج بھی کسی سائنٹیفک فیلوشپ

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے آگے)

"باگ (BOG) یعنی خدا کا لفظ اسی مادے سے مشتق ہے جس سے کہ لفظ امیر بنا ہے اس لیے خدا، قوت، طاقت اور امارت کا ہم معنی ہے۔ ذات باری کا دوسرا نام لارڈ ہے۔ یہ لفظ غلام کی ضد ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بعض لوگ حاکم سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سارے الفاظ ایک ہی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔ خدا پر یقین چند نفرت انگیز حسی اور مادی صفات کا اظہار ہے۔ یہ نہ صرف اس دنیا میں غلامی بلکہ ساری کائنات میں غلامی کے اقرار کا دوسرا نام ہے۔"

ان الفاظ سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے انکار کے لیے کس قسم کے بھونڈے دلائل لائے جا رہے ہیں۔

کا کامیاب امیدوار نہیں ہو سکتا۔

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ شہادت کی قدر و قیمت جانچنے میں انسان کے تعصب کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ مگر دلائل کی قوت یا کمزوری کے معاملے میں تعصب و عدمِ تعصب کا لحاظ کرنا درست نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ارواح پر اعتقاد رکھتا ہے تو جن بھوت کے متعلق اس کی شہادت کو جانچنے میں ہم اس کے تعصب کا ضرور لحاظ کریں گے کیونکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نظر پر اس کے اعتقادِ ارواح کا تسلط ہے۔ لیکن کسی شخص کے دلائل کے مقابلے میں یہ استدلال کرنا کہ وہ متعصب ہے۔ ایک احمقانہ بات ہے۔

دنیا کا ہر وہ شخص جو اپنا کچھ نظریہ یا اعتقاد رکھتا ہے کسی حد تک متعصب ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو مذہبی اور لامذہبی دونوں طریقوں کے پیرو اپنے مخصوص طریقے کے حق میں متعصب ہیں لیکن لادین اہلِ سائنس ہمیشہ تعصب کا بہانہ بنا کر اہلِ دین کی تنقیدوں کو رد کر دیتے ہیں حالانکہ اہلِ مذہب کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ مشہور سائنس دان میوارٹ MIVART نے ڈارون کے نظریئے کے پرخچے اڑا دیئے ہیں اور اس قدر مدلل تنقید کی جس کا جواب کسی ڈارونی سے بن نہ آیا مگر اس کے نقد کو صرف اس لیے ناقابلِ اعتنا سمجھا گیا کہ وہ ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو دنیائے سائنس سے خارج تھا۔

اگر محض کسی شخص کے اندر تعصب ثابت کر دینے پر اس کے خیالات کو رد کر دینا صحیح اور جائز ہو تو پھر مذہب پر ہکسلے اور اس کے ہم خیال لوگوں کے اعتراضات کو بھی ناقابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ سب حضرات تعصب میں گرفتار تھے۔ معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ہر وکیل اور بیرسٹر کے دلائل کو صرف اس بنا پر ٹھکرایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مؤکل کے حق میں تعصب رکھتا ہے۔ دنیا کا کون سا ایسا فرد ہے جو تعصب کی ہر آلائش سے

پاک ہو۔ ایک مضبوط دلیل بہر حال مضبوط ہے، خواہ متعصب کی طرف سے پیش کی جائے یا غیر متعصب کی طرف سے، ایک مرتبہ انگلستان کے ایک جج نے ایک بیرسٹر کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"تمہارے دلائل محض اس بنا پر کمزور نہیں ہو سکتے کہ تم اپنے مؤکل کو قصور وار سمجھتے ہو یا وہ اس وجہ سے مضبوط نہیں ٹھہرائے جا سکتے کہ تم اسے معصوم خیال کرتے ہو۔"

تعصب کے اس عام الزام کے علاوہ ڈاروِن کے حامی بسا اوقات مخالف کے دلائل کا محض یہ کہہ کر استخفاف کرتے ہیں کہ یہ شخص اناڑی AMATEUR ہے یا اس نے کبھی کوئی سائنٹفک تربیت نہیں پائی۔ یہاں پھر وہی غلطی کی جاتی ہے۔ ایک مصنف اگر کسی مسئلے میں اپنی شہادت یا رائے پیش کرے تو آپ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ کس قابلیت کا آدمی ہے مگر جب وہ اپنے دلائل پیش کرے یا اعتراض کرے تو آپ کو اس کی حجت سے بحث کرنی چاہیئے نہ کہ اس کی قابلیت سے۔

ڈاروِن کے مداحوں نے اپنے مخالفین کے اعتراضات کو بے وزن ثابت کرنے کے لیے اسی قسم کی چالاکی اور عیاری سے کام لیا۔ یہاں اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں لیکن سموئیل بٹلر کے معاملے میں ان حضرات نے جو متعصبانہ روش اختیار کی وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ جس شخص نے بھی ڈاروِن پر سموئیل بٹلر کی تنقید پڑھی ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ اس کا جائزہ بڑا ہی فاضلانہ تھا۔ خود اہل سائنس میں سے بھی کئی ایک نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر جے اے ٹامسن نے اس کے نقد کو نہایت عالمانہ قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ بٹلر نے نظریۂ یادداشت پیش کر کے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ گو اُس نے سائنس کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی مگر وہ سائنٹفک دماغ رکھتا ہے اور سائنٹفک انداز

سے سوچ سکتا ہے اور اس باب میں کسی پیشہ ور سائنسدان سے کم نہیں ہے۔ اس کی کتاب "زندگی اور عادت" جو ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی ایک نہایت آبدار ومرصع کتاب تھی جو ایک سائنٹفک مسئلے پر ریسرچ کر کے ایک عامی نے لکھی تھی۔ اس کتاب میں بٹلر نے ثابت کیا ہے کہ جس چیز کو ہم جبلت کہتے ہیں وہ دراصل حافظے کا رسوخ ہے۔ اس کتاب کو علمی حلقوں میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن بٹلر کی ساری قابلیت اور ذہانت کے باوجود ڈاروِن پر اس شخص کی تنقید کو ناقابلِ اعتنا قرار دیا گیا، بلکہ دنیائے سائنس نے بٹلر کا بالکل مقاطعہ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس دانوں نے ایک جتھہ بنا رکھا ہے اور وہ سائنس کے اجارہ دار بن کر کوشش کرتے ہیں کہ اپنے گروہ کی حدود سے باہر کے کسی آدمی کو داخل نہ ہونے دیں۔

سائنس دانوں کی اس تنگ نظری اور تعصب کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بٹلر کے نظریۂ حفظ کا سارا کریڈٹ ہیرنگ کو دے دیا اور بٹلر کا نام تک نہ لیا حالانکہ اس نظریہ کے ساتھ اس "اناڑی سائنس دان" کا بالکل وہی تعلق ہے جو نظریۂ انتخابِ طبیعی کے ساتھ ڈاروِن کا ہے۔ اس سوقیانہ سلوک کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہیرنگ ان کے اپنے گروہ کا آدمی تھا اور بٹلر ان کی پارٹی کا مخالف۔

اس تعصب کی مثالیں ہمیں خود ڈاروِن کی تحریروں میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ اس نے اپنی تحریروں میں اپنے پیشروؤں کے علمی کارناموں کا بہت کم اعتراف کیا ہے۔ اس کی کتاب اصل الانواع میں لامارک کی طرف صرف ایک سرسری سا اشارہ ملتا ہے۔ ڈاروِن کے بعض حامی اس کی اس روش کے لیے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اسے اپنے پیشروؤں کے کارناموں کا علم نہ تھا لیکن یہ عذر ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ خود ڈاروِن نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے سر چارلس لائل کی کتاب PRINCIPLES OF GEOLOGY

سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ لائل نے اس کتاب میں ایک پورا باب لامارک کے متعلق لکھا ہے اور اس کے مقالہ "اصول تحول" کو خود اس کی اپنی عبارت میں نقل کیا ہے۔

لائل کے اس فعل پر ڈاروِن صاحب بہت بھنائے اور انہوں نے یہ دیکھ کر کہ لائل نے ڈارونیت کو لامارک کے نظریئے کی محض ایک جزئی تبدیلی و تعدیل MODIFI-CATION قرار دیا تھا اس سے مراسلت کی اور لکھا کہ "لامارک کی کتاب ایک لغو کتاب ہے جس سے میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا"

اور تو اور ڈاروِن نے خود اپنے دادا کے کارناموں پر بھی پانی پھیرا اور اس کا بھی اعتراف نہ کیا حتےٰ کہ وہ اتنا بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس سے پہلے کچھ لوگ نظریۂ ارتقا کے لیے راہ ہموار کر گئے تھے۔ آخر کار جب اس کی چوری پکڑی گئی تو پھر مجبوراً اس نے بفون اور اراسمس ڈاروِن کا اعتراف کیا اور لامارک کے متعلق چند تحقیر آمیز فقرے لکھے۔ اور یہ اس وقت ہوا جب "اصل الانواع" کے چھ ہزار نسخے فروخت ہو چکے تھے:

ڈی لیچ ڈاروِن کے اس طرزِ عمل پر بڑی حیرانی کے ساتھ لکھتا ہے:

"ہم حیران ہیں کہ آخر ڈاروِن نے لامارک کے نظریۂ تحول کا جو دراصل اس کے نظریۂ ارتقا کی بنیاد ہے، کیوں اعتراف نہیں کیا"

اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ڈاروِن اور اس کے ہم خیال ساتھیوں میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے جس سے کسی دوسرے شخص کی قابلیت یا ذہنی برتری ظاہر ہو سکے۔ وہ اس بات کے دعویدار تھے کہ کائنات کی جو میکانکی تشریح انہوں نے کی ہے وہ محض انہیں کی دماغی کاوش کا ثمرہ ہے، اس لیے کسی دوسرے فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پر لب کشائی کرے۔ اگر کوئی شخص اس نظریہ کا سو فیصدی حامی ہوتا تو وہ عالم اور فاضل تسلیم کیا جاتا لیکن اس کے برعکس

اگر کوئی دوسرا علم وفضل کے باوجود کائنات کی اس مادی تعبیر سے اختلاف کرتا، تو اسے جاہل اور ناتربیت یافتہ کہہ کر یکسر نظرانداز کر دیا جاتا۔ تعصب، تنگ نظری کی اس سے زیادہ افسوسناک صورت اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تو ہے وہ ذہنی ساخت جس کے ساتھ نظریہ ارتقا پروان چڑھا۔ اب ذرا ایک نظر اس طریقِ کار پر بھی ڈال لیں جس کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوئی۔

نظریۂ ارتقاء کی تکمیل کا طریق کار

ارتقاء کے پورے لٹریچر کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ سارا لٹریچر ایسے دعوؤں سے بھرا پڑا ہے جن کی حقائق تصدیق نہیں کرتے۔ علمی مفروضات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا کہ وہ عالمگیر سچائیاں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے گویا کہ قانونِ ارتقاء جیسی کوئی چیز حقیقۃً دنیا میں موجود ہے۔ درآنحالیکہ اس نظریہ کے ثبوت میں کوئی براہ راست شہادت ہمیں نہیں ملتی ہے۔ جن واقعات اور شہادت سے ارتقاء کا استدلال کیا جاتا ہے ان کی دوسری توجیہات بھی کی جا سکتی ہیں اور ان توجیہات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا انحصار ہمارے اس میلان پر ہے جو فطری طور پر ہم الٰہیت یا دہریت کی جانب رکھتے ہیں۔ نظریۂ ارتقاء کو جس طریق سے ثابت کیا جاتا ہے وہ عملاً یہ ہے کہ چند ہڈیوں کے مل جانے سے تخیلات کی ایک پوری عمارت کھڑی کر لی جاتی ہے۔ قیاس ہی قیاس سے ان ہڈیوں کو جوڑ کر ایک ڈھانچہ بنایا جاتا ہے، پھر اس پر گوشت پوست چڑھایا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کو ایک خاص شکل کا جانور بنا کے ایک نام رکھا جاتا ہے۔ پھر قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ فلاں فلاں جانور کی نسل سے ہوگا۔ غرض وہم ہی وہم سے اس کا پورا شجرۂ نسب تیار ہوتا ہے اور ہر پشت کے لیے ایک نام تجویز کر لیا جاتا ہے۔ لوگ ان ناموں کو پڑھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ فی الواقع اس پورے معجزے کا ثبوت طبقات الارض میں مل چکا ہے اور ان ناموں کے جانور حقیقت

میں موجود تھے۔ درآنحالیکہ ان کا وجود صرف ارتقاء پر ایمان لانے والے سائنس دانوں کے تخیّل میں ہے اور خارج میں ان کا کوئی نشان موجود نہیں ہے۔

مثال کے طور پر چند سال ہوئے جاوا میں ایک کا سہ سر اور چند ہڈیاں ملیں جن کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ بندر کے مورث اعلیٰ کی ہڈیاں ہیں۔ پھر اس کو ایک نام دے کر اس کا پورا ڈھانچہ تخیّل میں بنا کے اور گوشت پوست چڑھا کے اتنی باریکی کے ساتھ اس کی صورت گری کی گئی کہ بال اور خدوخال بلکہ عادات و خصائل تک متعین کر لیے گئے۔ اس کا نام اس طرح رکھ لیا گیا گویا کہ وہ ایک تاریخی حیوان ہے۔ حتیٰ کہ اس کی تصویریں تک علمی رسالوں میں چھپ گئیں جن میں وہ اچھا خاصا ایک مکمل اور زندہ جانور نظر آتا ہے۔ ایک ناواقف اس تصویر کو دیکھ کر یہ گمان نہیں کر سکتا کہ اس پوری تصویر میں صرف ایک ران کی ہڈی چند دانت اور ایک حصّہ کاسۂ سر تو حقیقی ہیں اور باقی سب تخیّل کی پُرکاری۔

جس جانور کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کی تو پھر بھی ہڈیاں موجود تھیں لیکن ارتقائی سائنس دانوں کی ضرورت نے بعض ایسے جانوروں کی صورت گری کی جن کا اتنا وجود بھی نہ تھا مثلاً جب یہ نظریہ کہ پرندے رینگنے والے جانور کی ارتقائی صورت ہیں، آرکیوپٹرکس سے ثابت نہ ہو سکا کیونکہ اس کے اچھے خاصے پر موجود ہیں تو پھر یہ فرض کر لیا گیا کہ ایک قسم کا رینگنے والا جانور ایک درخت میں رہتا تھا، اس نے ایک ڈالی سے دوسری ڈالی پر اچکنا شروع کیا اور یہ اچکنے کی عادت اس قدر بڑھی کہ اس کے اثر سے رفتہ رفتہ اس کے پر نکلنے لگے۔ یہ سب کچھ واہمہ اور قیاس تھا۔ مگر ارتقائی سائنس دان اس تصوّر میں ایسے محو ہوئے کہ اُن کے سامنے فی الواقع ایک ایسا جانور نمودار ہو گیا، کہ انہوں نے اسے ایک حقیقی وجود سمجھ کر اس کا نام پراویس PROAVES رکھ لیا۔

یہ حضرات سوچنے کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں کہ نظریہ کا اثبات اس پر موقو

ہے کہ فلاں فلاں گم شدہ کڑیاں دستیاب ہوجائیں۔ پھر اپنے نظریئے کو ثابت کرنے کی لے چینی انہیں غور کرنے پر مجبور کرتی ہے: کہ ان گم شدہ کڑیوں کی کیا کیا شکلیں ہونی چاہئیں پھر وہ فرض کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ایسا ہوا ہوگا۔ اس کے بعد تخیل جب زیادہ جم جاتا ہے تو وہ ان کو حقیقت نظر آنے لگتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ایسا ہے۔

مثال کے طور پر مسٹر ہیکرافٹ جو زندہ جانوروں پر ایک نہایت قابلِ اعتماد سند ہیں بیان کرنا شروع کرتے ہیں کہ "پرادیس" کے پَر کس طرح نکلے اور اس کی ترتیب اور تدریجی ترقی اس تفصیل کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ مسٹر ہیکرافٹ دراصل ایک بالکل خیالی وجود کی نقش آرائی کر رہے ہیں جس کی ہڈیاں تو درکنار جس کا ایک بال تک بھی ارضیاتی روداد میں دستیاب نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں "پرادیس" کی جو تصویر درج کی ہے اس پر یہ نہیں لکھا کہ "ایک فرضی جانور کی خیالی تصویر" بلکہ یہ لکھا ہے: ONE OF THE PROAVES — گویا یہ جانور جس کا مرقع یہاں دکھایا جا رہا ہے کسی زرخیز دماغ کی تخیل کاری کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور کسی چڑیا گھر میں اب بھی اس کی زیارت کی جاسکتی ہے یا کسی عجائب خانے میں کم از کم اس کے ڈھانچہ سے تعارف ہو سکتا ہے۔

ایک اور سائنس نواز مسٹر ہیکل HECKEL نے انسان کا خیالی نسب نامہ تیار کیا ہے جس میں بندر اور انسان کے درمیان قریب قریب دو درجن کڑیاں گنا دی ہیں جن میں سے ہر کڑی ایک ثقیل نام سے موسوم ہے۔ سائنس دانوں پر ایمان رکھنے والا غیر سائنس دان اس نسب نامے کو دیکھ کر سمجھے گا کہ ان میں سے ہر کڑی زندہ یا حجری صورت میں دستیاب ہو چکی ہے تبھی تو اس کی تفصیلی صورت اور اس کا نام تک ایک سائنس دان نے بیان کر دیا ہے۔ اس بیچارے کو کیا خبر کہ یہ سب محض

ایک سائنس داں کی افسانہ طرازی ہے، ان کڑیوں میں سے ایک نے بھی طبقات زمین میں کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے اور اس لیے ان آبائے اولین کا کوئی وجود ہیکل صاحب کے تخیل سے باہر نہیں ہے۔ ارتقائی لٹریچر میں اس قسم کے شجرہ ہائے نسب بکثرت ملتے ہیں مگر قریب قریب سب کا حال ہیکل صاحب کے نسب نامے کا سا ہے۔

یہ ان لوگوں کا حال ہے جو اہلِ مذہب کو خدا اور فرشتوں اور جن اور وحی والہام و دوزخ و جنت کے مفروضات پیش کرنے پر اوہام پرستی کا طعنہ دیتے ہیں اور جن کا یہ موقف ہے کہ آدمی جو بھی بات زبان سے نکالے اس کا زندہ ثبوت اور شہادت پیش کرے اور اگر اس نے کوئی بات شہادت کے بغیر بیان کی تو بقول ہکسلے وہ نہ صرف غلط گو ہے بلکہ مجرم بھی ہے۔

پھر یہ حضرات عام لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ نظریۂ ارتقا میں انسان اور حیوان کے درمیان صرف ایک ہی کڑی مفقود ہے حالانکہ درحقیقت اس زنجیر میں مسلسل دو موجود کڑیوں کے درمیان ایک کڑی ناپید ہوتی ہے اور جس کڑی کو مفقود کہا جاتا ہے وہ دراصل مفروضہ کڑی ہے کیونکہ اس میں صرف یہ قیاس کر لیا گیا ہے کہ ایسی ایک کڑی موجود ہوگی مگر وہ کھوئی گئی۔ ایسی کوئی شہادت آج تک دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ گمان کرنے کی معقول وجہ ہو کہ ایسی کوئی کڑی درحقیقت موجود تھی۔ یہ لوگ مفروضہ کڑیوں کو مفقود کڑیاں قرار دے کر اس فقدان کو ارضیاتی روداد کا نقص قرار دیتے ہیں مگر یہ محسوس نہیں کرتے کہ ایسی مفروضہ کڑیوں کا عدم وجود ارضیاتی روداد کے نقص سے زیادہ خود ان کے اپنے استدلال کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کے ادنیٰ ترین درجے اور حیوانات کے بلند ترین درجے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قدیم ترین انسان کے بارے میں بھی جو کچھ ہم جانتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان

روئے زمین پر اپنی نمود کی ابتدا ہی سے بلند ترین حیوانات پر ناقابلِ پیمائش تفوق رکھتا ہے۔ ڈارون اور اس کے حامی ہڈیوں اور ڈھانچوں کی مدد سے انسان اور حیوان کے درمیان ایک ارتقائی تعلق قائم کرنے میں بالفرض اگر کامیاب بھی ہو جائیں تو ان دونوں کے درمیان جو نفسی فرق ہے، وہ اتنا عظیم ہے کہ سائنس دانوں کی کوئی شاعرانہ "کوشش" بھی ان کڑیوں کو ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اصل میں کڑی ایک ہی ہے جسے ان "ناد انوں" نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے اور وہ کڑی ایک صانع، حکیم کی صفت ہے۔ اس کو کھو کر یہ لوگ اندھوں کی طرح بالکل تاریکی میں صدیوں سے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

دوسرا باب

وجود خالق کائنات

دنیا میں بے شمار حقائق ایسے ہیں جنہیں ہم فطری طور پر مانتے چلے جاتے ہیں اور ان کی صداقت کے بارے میں ہمیں کبھی شک وشبہ نہیں گزرتا۔ ان کا اقرار ہماری فطرت میں داخل ہوتا ہے اور انہیں تسلیم کرنے کے لیے ہمارا وجدان ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ اگر ہم ان بدیہی حقائق کو تسلیم نہ کریں تو ہم اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتے ہیں۔

وجودِ خالق کا اعتقاد بھی انہی بدیہی حقائق میں سے ایک بڑی حقیقت ہے۔ یہ اعتقاد فطرتِ انسانی کا ایک لازمی جزو ہے اور دلائل وبراہین کی ترتیب وتدوین سے قبل بھی انسان کے دل ودماغ میں راسخ تھا۔ ایک انگریز لڑکے، ایک ان پڑھ مسلمان، ایک تعلیم یافتہ ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی عالم وفقیہ سے پوچھئیے کہ خدا کیا ہے اور پھر ان کے جوابات پر غور کیجئے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی بلند وبالا ذات کا تصور جو اس کائنات کی علّتِ اولیٰ ہے۔ مسٹر میکڈانلڈ جو مدّت تک افریقہ کی وحشی قوموں میں رہے ہیں، اپنی کتاب "افریقین" میں لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور اس کائنات کا منبع ومبدأ ہے۔ آخر انسان کے اندر وہ کونسا ایسا احساس تھا جس نے انسان کو مظاہرِ قدرت کے سامنے جھکا دیا۔ وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا۔ وہ کیا تھا جس نے اس کو تلاطم خیز دریاؤں یا سر بفلک پہاڑوں

کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے پر مجبور کیا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر تھا۔ ڈر تھا تو وہ بھاگ جاتے، چھپ جاتے لیکن اس کے بجائے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو ازلی وابدی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو وہ مرنے سے ڈرتے لیکن انہیں روح کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ خالقِ کائنات کا احساس تو اُن بچوں تک میں پایا گیا جو الگ تھلگ رکھے گئے جنہیں کسی قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی کسی خارجی امداد کے بغیر صرف اپنے وجدان کی بنیاد پر اس تصور کی تائید کی۔

انسان لاکھ سر مارے مگر وہ اس ساعت کو کبھی متعین نہیں کر سکتا، جب اس کے اندر وجود خالق کے احساس نے جنم لیا تھا۔ یہ سب شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ یہ اعتقاد کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے اور خود بخود ہمارے نفس میں فطرت نے ودیعت کر رکھا ہے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ نفس الامری حقیقت ہے جس کو انسان بغیر کسی ردّ وکد کے تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ گویا یہ تصور انسان کی گھٹی میں داخل ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو توڑ نہیں سکتا اسی طرح ایمان باللہ سے جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے، روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید اپنے بلیغانہ انداز میں یوں پیش کرتا ہے:

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (ابراہیم: ۱۰)	"کیا آسمان و زمین پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے"؟
قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ۔	"کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا اور تمہارا رب ہے"؟

خدا کے وجود کا اعتراف چونکہ انسان کے وجدان میں داخل ہے اس لیے خدا نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

"اپنا رُخ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر۔ یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

قرآن مجید اسی بدیہی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر روزِ ازل کے اُس عہد و پیمان سے تعبیر کرتا ہے جو خالق و مخلوق کے مابین ہُوا تھا۔ یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور ہزار انکار کے باوجود انسانی فکر و عمل کے بیشمار گوشوں میں اس کے اثرات جھلکتے نظر آتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (اعراف - ۱۷۲)

"اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا تھا اور خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہیں"۔

کلامِ الٰہی کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اس طرزِ استدلال کے بے شمار نمونے ملیں گے۔ قرآنِ مجید کا شاید ہی کوئی رکوع ایسا ہو جس میں انسان کی اس فطری پکار کی طرف اشارہ نہ ملتا ہو۔ یہ دلیل سب سے قوی اور سب سے زیادہ مضبوط ہے، کیونکہ یہ انسانی رُوح کا بنیادی تقاضا ہے۔

انسان اپنی ہستی کے ثبوت کے لیے کسی منطقی دلیل کا محتاج نہیں۔ یہ ایسی معرفتِ طبعی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔ آخر انسانی ہستی کا ثبوت اس کی معرفتِ طبعی سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ معرفت انسانی عقل اور اخلاقی فطرت کے لیے کافی نہیں تو

پھر دنیا کا کوئی منطقی استدلال اور کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔

جب انسان نے اس امر کو جان لیا کہ وہ ہے اور اپنی ہستی کا خود باعث بھی نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ کیسے یہاں آیا۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ اس کے وجود سے پہلے اور اسباب تھے اور اُن سے پہلے اور، اور اُن سے پہلے اور۔ اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو انسانی تخلیق کا سبب نہیں تو انسان بے سبب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ذات ایسی ہے جو ان اسباب کو ترتیب دیتی ہے۔ لہٰذا انسان کی علتِ تخلیق کوئی اور ہے، جو ان سب سے بالا ہے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے اس بدیہی حقیقت کا کہ انسان ہے اور وہ اس امر کو جانتا ہے جب انسان موجود ہے اور اسے اپنے وجود کے بارے میں کوئی شک نہیں گزرتا تو پھر اپنے خالق و مالک کے وجود کے متعلق وہ کیوں کسی شبہ میں گرفتار ہوتا ہے؟ اس ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود بھی اسی طرح کی ایک ٹھوس حقیقت ہے جس طرح کہ انسان، اور یہ ساری کائنات جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے جب مخلوق کا وجود بغیر کسی شک کے ہمیں تسلیم ہے تو خالق کے وجود کا بھی ایک بدیہی حقیقت کے طور پہ ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ؟ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يُوقِنُونَ	"کیا کسی اور چیز نے انہیں جامۂ خلقت عطا کیا ہے یا وہی اپنے آپ کے خالق ہیں، یا اُن ہی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے"۔

(طور - ۲)

انسان کی فطری پکار

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس فطری پکار کی طرف ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی بحث کی ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب انسان خوشحال ہو، جب زندگی کے آلام و مصائب اسے پریشان نہ کر رہے ہوں تو اس کی طبیعت میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کو اپنی قابلیت و استعداد پر محمول کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر جذبۂ انانیت بھی ابھرنا شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مالک اور خالق سے ہر لحظہ دُور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ یہ ساری کائنات میرے وجود کی محتاج ہے۔ سب میرے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہیں اور مجھے کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل غیر مسئول ہوں، کوئی مجھ سے باز پُرس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انسانی فطرت مسخ ہونا شروع ہوتی ہے اور اس کے اندر اپنے مالک کو پہچاننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

انسانی فطرت درحقیقت اس وقت نکھر کر سامنے آتی ہے جب کسی انسان کی جان پر آبنے، جب شدائد و مصائب اس پر ہر طرف سے ہجوم کریں اور وہ ان کی یلغار کے سامنے بالکل بے بس ہو، جب عقل اپنی ساری صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بیکار ثابت ہو رہی ہو، اس موقع پر انسان اپنے سارے حجابات دُور کر کے اپنے اصلی رُوپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر اس کی انانیت بھی سرنگوں ہوتی ہے اور وہ اس بات کے لیے مضطرب ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مالکِ حقیقی کے حوالے کر دے جو زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہے اور جس کی طرف رجوع کرنے کے بعد انسان سارے دنیاوی سہاروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ

"ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو، بلکہ اُس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے

مَاتَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ۔

الانعام ۴۰، ۴۱

ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے، ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔"

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کو ایک دوسرے پیرایہ میں یوں بیان فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ

وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۔

(یونس ۲۲)

"وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔"

حاسۂ عبودیت

انسان کے دل میں یہ احساس کہ اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے۔ ہمارے دل میں ایک ہلکی سی لَے کی طرح ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اشپرانگر کسی کے ہاں اس سے زلزلہ و طوفان اٹھتے ہیں، کسی کے اندر اس سے قلندرانہ وجد و حال پیدا ہوتا ہے، کسی کے دل میں یہ اس خاموشی سے محو

خواب ہوتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی یا سطحیت کا شعور تک نہیں ہوتا۔ لیکن ہر صورت میں اس کی موجودگی ایک امرِ واقعہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خود اس'

"دیکھے بھالے، بن سوجھے جانے پہچانے، بن بوجھے"

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کا وجود ضروری ہے۔ اگر غصہ آئے گا تو کسی بات یا شخص پر، اگر مسرت کی لہر دوڑے گی تو کسی چیز یا خیال سے، احترام کے جذبات موجزن ہوں گے اور عقیدت پیدا ہو گی تو کسی شخص، گروہ یا نظریے کے لیے۔ غرض ہر نفسی کیفیت کے لیے ایک معروض ہونا ناگزیر ہے۔ یہ معروضات ضروری نہیں کہ محسوس اشیاء ہی ہوں۔ یہ پیکر محسوس بھی ہو سکتے ہیں اور خیالات و تصورات بھی۔ بلکہ اکثر صورتوں میں دیکھا گیا ہے کہ خیالات و تصورات سے انسان کے دل کی دنیا جتنی زیر و زبر ہوتی ہے اتنی محسوسات سے نہیں ہوتی۔ غلطی کا احساس جتنی زیادہ ندامت پیدا کرتا ہے، خود گناہ کا ارتکاب کرتے وقت اتنا شدید احساس نہیں ہوتا۔ دل شکن اور تلخ بات خود اتنی زیادہ ناگوار محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ تھوڑی دیر بعد اس کی یاد۔ اب اگر بھوک کا احساس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی چیز ایسی موجود ہے جس سے بھوک مٹائی جا سکتی ہے یا محبت کا احساس اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ کوئی ذات، عقیدہ یا نظریہ ایسا ہے جو اس کے جذبۂ محبت کی تسکین کر سکتا ہے تو آخر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے کہ انسان کے اندر جب یہ فطری احساس پایا جاتا ہے کہ اس عالمِ مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظامِ کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک اَن دیکھا نظام موجود ہے تو اس کی تہ میں بھی کچھ اَن دیکھے حقائق کا وجود ناگزیر ہے۔ جب ہم ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں تو آخر مذہبی احساس کے لیے کسی معروض کو کیوں ضروری نہیں سمجھتے۔ اس معروض کا وجود دوسرے تمام معروضات سے کہیں زیادہ اہم

ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسّی کیفیات ہر وقت پیدا نہیں ہوتیں۔ مثلاً ہمیں بھوک مٹانے اور پیاس بجھانے والی اشیاء کا خیال اس وقت آتا ہے جب ہمیں اس کے لیے تحریک ہو۔ مگر مذہبی احساس سے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ ہم کوئی خیال دل میں لاتے ہوئے یا کوئی عمل کرتے ہوئے یہ بات سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ یہ خیال یا فعل عالمِ محسوسات سے ماوراء اَن دیکھے نظام سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔

جس طرح ہمارے حسّی داعیات مادی اشیاء کے حصول سے تسکین پاتے ہیں، بالکل اسی طرح ہمارا حاسۂ مذہبی جو ان داعیات سے کہیں زیادہ انسانی فطرت کا لازمی عنصر ہے۔ کسی ذات میں الوہیت کی شان دیکھ کر اطمینان پاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس ہستی میں وہ الوہیت کی شان دیکھتا ہے وہ فی الحقیقت اس کی اہل بھی ہو۔ وہ بسا اوقات اپنی حماقت یا بے بصری سے اُس کو اُن ہستیوں یا محسوس اور غیر محسوس پیکروں میں تلاش کرتا ہے جہاں اس کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الوہیت کی شان دیکھے بغیر اور اس کے ساتھ رشتۂ عبودیت قائم کیے بغیر زندگی کا خلاء پُر نہیں ہوتا۔ انسان کو اپنا نظامِ تنفّس قائم رکھنے اور اپنی بقا کے لیے پاکیزہ ہَوا کی ضرورت رہتی ہے لیکن اگر پاکیزہ ہوا میسّر نہ ہو تو وہ خلاء میں زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ اس ضرورت کو وہ کثیف ہَوا ہی سے پورا کر کے سانس کے رشتہ کو ہر حال میں قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، بالکل اسی طرح اگر ایک فرد اُس قادرِ مطلق خدا کی معرفت تک نہیں پہنچتا جس کی ذات الوہیت کا بلا شرکتِ غیر استحقاق رکھتی ہے تو اس کا مذہبی احساس اپنی تسکین کے لیے کچھ جھوٹے الٰہ بنا کر ان کی بندگی اختیار کر کے اپنے اس مذہبی اور روحانی خلا کو پُر کرتا ہے۔

جس طرح سانس اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے بالکل اسی طرح انسان کو احساسِ بندگی سے جُدا نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ کسی الٰہ کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

انسان نے مختلف اوقات میں مختلف ہستیوں یا مختلف اشیاء کو الٰہ بنایا، لیکن اس نے اپنے حاسۂ مذہبی کی تسکین کے لیے کبھی ان ہستیوں یا چیزوں کی طرف ان کی اصل کے اعتبار سے رجوع نہیں کیا۔ اس کی روح ان کے اندر الوہیت تلاش کر کے اطمینان کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ انسان کبھی درختوں اور پتھروں کے سامنے سربسجود ہوا، کبھی پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کے سامنے جبینِ نیاز جھکائی، اور دورِ جدید میں ملک، قوم، وطن، معاشرے اور ریاست کو خدا بنا کر اس کی پرستش شروع کی، لیکن ان جھوٹے خداؤں کے پرستاروں کی اگر ذہنی کیفیت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ ان میں سے کسی ہستی، چیز یا ادارے کو بجائے خود الٰہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ انہیں مظاہرِ الوہیت سمجھ کر ان کی بندگی کرتے ہیں۔

مذہب اور فلسفۂ مذہب کے بعض مغربی مفکرین نے حاسۂ مذہبی کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عجیب و غریب ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ حاسۂ مذہبی کوئی الگ احساس نہیں بلکہ انسان کے حسی داعیات ہی کا حصہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مؤقف کی حمایت میں یہ دلیل دی کہ انسان جب اشیاء یا شخصیتوں سے مستفید ہونے کی توقع رکھتا یا اُن سے خوف محسوس کرتا ہے تو انہیں خدا بنا لیتا ہے۔ فائدے کی توقع اور نقصان کے اندیشے سے کبھی کسی چیز یا ذات میں شانِ الوہیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے انسان کے اندر مفید اشیاء کے حصول کی خواہش اور مضرت رساں اشیاء سے بچنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ الوہیت اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس سے انسان کے حاسۂ مذہبی کی تسکین ہوتی ہے اور جس ذات میں وہ اسے جلوہ گر پاتا ہے اس کے سامنے سر جھکا کر اپنی روح کو پوری کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کرتے ہوئے اسے سکین پہنچاتا ہے چنانچہ دیکھیے کہ خود اُن مذاہب میں بھی جو "پیکرِ محسوس" کی پرستش کرتے ہیں یہ پیکر محض ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، اور

انسان اُن کی مدد سے الوہیت کے اُس منبع تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں سے اُس کی روحانی پیاس بجھ سکتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی توجہ صرف اِن پیکرانِ محسوس تک ہی محدود نہیں رکھتا، بلکہ اِن سے گزر کر فوراً صفاتِ الٰہی کے تصورات تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیکرہائے محسوس وہ ایمانی کیفیت پیدا نہیں کر سکتے جس کا انسان کی فطرت تقاضا کرتی ہے۔

کیفیتِ ایمانی

اب سوال یہ ہے کہ خود یہ ایمانی کیفیت کیا ہے جس کے تحت انسان اَن دیکھی حقیقت کو محسوس و مشہود حقیقت سے زیادہ یقین کے ساتھ مانتا اور اُس سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمانی کیفیت درحقیقت ایک ایسا مثبت فطری جذبہ ہے جس کے زیرِ اثر محدود لامحدود کی معرفت حاصل کر کے اس کی تصدیق کرتا ہے اور پھر اپنی زندگی کو اُس کی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں اہلِ ایمان کو صدّیق کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ۔ (الحدید۔۱۹)	"اور جو لوگ خدا اور اس کے انبیاء پر ایمان لائے وہی صدّیق ہیں۔"

پھر قرآنِ مجید نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان ایک ایسی قلبی کیفیت کا نام ہے جس سے انسان کو یقین کے ساتھ طمانیت کی دولت بھی حاصل ہو، کیونکہ انسان کا یقین اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا جب تک اس کا دل کسی حقیقت پر مطمئن نہ ہو جائے۔ اس طرح انسان کے دل کی گہرائیوں میں اَن دیکھی حقیقت کا احساس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ مگر ہم اسے گرفت میں نہیں لا سکتے۔ اس وقت انسان کی حالت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے، ؏

دل می داند و من دانم و داند دلِ من

معاملہ پھر انہیں دو جذبات پر ختم نہیں ہوتا بلکہ جب انسان کے دل میں یقین پوری طرح

راسخ ہوجاتا ہے اور انسان کو اپنے عقیدے پر پوری طمانیت حاصل ہوجاتی ہے تو پھر وہ بندگی کے دوسرے لوازم پورے کرتا ہے۔ انسان کسی ذات یا ادارے کو اس وقت تک الٰہ بنا کر اپنے حاسۂ مذہبی کی تسکین نہیں کر سکتا جب تک وہ اُلوہیت کے سارے تقاضے پورے نہ کرے اور اسے انسان کی خوش بختی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو اس اعتبار سے انسان کو مکمل سکون اور اطمینان مہیا کر سکے۔ خالقِ کائنات کے سوا انسان جتنے جھوٹے الٰہ بنا کر ان کی پرستش کرے گا اتنا ہی وہ مذہب اور روحانیت کے شیریں عُنصر سے محروم رہے گا۔

اَن دیکھے وجود کا احساس

اس اَن دیکھے وجود کے احساس کی مثالیں ہمیں زندگی میں ہر طرف ملتی ہیں خود ان لوگوں میں بھی جو ایمانی کیفیت پیدا کرنے کی کوئی خاص مشق یا کوشش نہیں کرتے، یہ احساس موجود رہتا ہے کہ کوئی علیم و خبیر ذات ہمیں دیکھ رہی ہے، کوئی قادرِ مطلق ہستی ہمارا احاطہ کیے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات دل کی انجان گہرائیوں میں ابھرنے والے معصیت آلود خیالات اس چشم ہمہ بیں کے احساس سے دب جاتے ہیں جب کہ دنیاوی گرفت و مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چور متاعِ غیر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کانپ اٹھتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی زبردست ہاتھ اسے پکڑ کر اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی طرح جب انسان مصائب میں گرفتار ہو کر گھبرا اٹھتا ہے اور ان کے چُنگل سے نکلنے کی کوئی امید اسے نظر نہیں آتی تو وہ سہمے ہوئے بچے کی طرح لاشعوری طور پر اُس آغوش کی طرف لپکتا ہے جو رحمت سے لبریز ہے اور جہاں سے کبھی کوئی ناکام و نامراد نہیں لوٹتا۔

اس اَن دیکھی ہستی سے کوئی شخص جتنا زیادہ تعلق پیدا کرے اسی نسبت سے اس کے لیے یہ ذات دیکھی بھالی، سمجھی بوجھی حقیقتوں سے زیادہ حقیقی چیز بن جاتی ہے۔

اور صفاتِ الٰہی رحیمی و کریمی، جباریّت و قہاریّت، عدل و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ چیز بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید نے صرف انسان کے اس وجدانی احساس کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے دلائل و براہین سے اس حقیقت کو ثابت بھی کیا ہے۔ اس نے جہاں انسان کے اس جذبۂ فطرت کو ابھارا ہے کہ ایک ازلی و ابدی ذات اس کائنات کی خالق و مالک ہے اور اسی کی مشیت اور ارادہ سب پر حاوی ہے، وہاں اس نے اس امر کا بھی پورا پورا اہتمام کیا ہے کہ یہ جذبہ خارجی اثرات سے دبنے نہ پائے اور اگر کبھی دب جائے تو غور و فکر کی قوت اسے مسلسل ابھارتی رہے اور اسطرح یہ زیرِ خاکستر آگ بھڑک کر انسان کے اندر ایمان کی حرارت اور یقین کا سوز پیدا کرے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انفس و آفاق میں ایسی نشانیاں رکھی ہیں جن سے ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کی نہایت واضح شہادت فراہم ہوتی ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۔ قیامہ: ۱۵	"انسان خواہ (ہزار) بہانے بناتا پھرے مگر وہ اپنے لیے خود دلیل ہے۔"
سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ حٰم السجدہ: ۵۳	"ہم عنقریب ان کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ تحقیق حق یہی ہے۔"
وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۙ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات ۲۰-۲۱)	"اور یقین کرنے والے کے لیے زمین میں اور خود تمہارے اپنے اندر نشانیاں ہیں۔ کیا تم نظر نہیں کرتے...."

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے متعلق غور و فکر کے لیے ایک صحیح نقطۂ نظر کی نشاندہی بھی کر دی ہے:۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (السجدہ: ۷-۸-۹)

وہی (ذات پاک ہے) جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ذلیل نچڑے پانی سے بنائی، پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے۔ تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔"

کائنات کے اس وسیع و پیچیدہ طلسم میں سب سے عجیب و غریب ہستی خود انسان ہے۔ مشتِ خاک سے اس کی پیدائش کا آغاز، پھر ایک حقیر اور بے جان قطرۂ آب کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے جسم کا سڈول اور متناسب بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتاً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں جبلت اور شعور و آگہی کی حیرت انگیز قوتیں اور صلاحیتیں پیدا ہو جانا سب خالق کے وجود کی زندہ شہادتیں ہیں۔

انسان کی ساخت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ مادی ذرات کی کرشمہ سازی نہیں، بلکہ کسی خالق و مالک کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم تسلیم کرلیں کہ انسان کی پیدائش میں سوائے مادہ کے اور کسی ذات کا دخل نہیں تو پھر پہلے ہی قدم پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کی غیر معین توانائی کے بطن سے معین مظاہر کیسے پیدا ہوگئے۔ انسان کے جسم میں ایک حسنِ ترتیب ہے جو کسی مرتب کے ذوقِ جمال کا آئینہ دار ہے۔ مادہ کے اندھے بہرے لزوم سے تو یہ چیز بالکل ناممکن ہے۔ پھر انسانی جسم کے تمام اعضاء میں ایک تناسب کی موجودگی اور مختلف خدمات کے لیے ان کی اہلیت و استعداد، اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس کائنات میں شروع ہی سے ایک قوتِ ناظمہ اور قوتِ رابطہ موجود ہے جس نے مادہ کے مختلف ذرات کو باہم جوڑ کر انہیں ایک انسان کی شکل عطا کی،

اور پھر اس انسان کے قطرۂ آب سے اس کی نسل کو آگے بڑھانے کا انتظام کیا اور اس میں بھی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ہر انسان کو ایک الگ سانچے میں ڈھالا۔ اعضاء کے اعتبار سے اگرچہ سب انسان یکساں ہیں مگر ان اعضا کے مابین تناسب کا رشتہ ہر انسان میں الگ الگ پایا جاتا ہے جو اسے دوسرے ابنائے جنس سے ممیز کرتا ہے۔

فطرت کی یہ ساری رنگارنگی کسی گہری تدبیر کی شہادت دیتی ہے۔ اگر "انسان سازی" کے اس وسیع وعریض کارخانے کو صرف مادہ کا عمل سمجھ لیا جائے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ بے منصوبہ عمل سے متناسب صورتیں کس طرح پیدا ہو گئیں، وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہوئی۔ یہ سوالات ایسے ہیں جن کی آپ علمِ طبیعیات یا علمِ کیمیا سے توجیہ نہیں کر سکتے۔ ان کی صحیح توجیہ اس اصول کو تسلیم کرنے سے ممکن ہے کہ "انسان سازی" کے یہ سارے کرشمے کسی کارسازِ حقیقی کی قدرت کے مظاہر ہیں۔

انسانی ساخت سے آگے بڑھیئے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ معلوم ہوتا ہے جس کی کوئی توضیح طبیعیات کے اصول سے ممکن نہیں۔ عناصر میں ظہورِ ترتیب سے انسانی شکل تو بن سکتی ہے مگر اس میں شعور و آگہی کا پیدا ہونا ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ انسان بار بار سوچتا ہے کہ آخر مادہ کی اندھی قوت نے شعور و ادراک کو کیسے جنم دیا۔ شعور بے شعوری کا غلاف چاک کر کے کیونکر ظاہر ہو گیا۔ پھر خود یہ شعور اس توانائی سے کس قدر مختلف ہے جس سے وہ بزعم مادہ پرستوں کے پیدا ہوا ہے۔ یہ سب چیزیں بڑی ہی حیران کن ہیں، اور سائنس ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتی۔

خالقِ کائنات یا مادہ کی کرشمہ سازیاں

بعض لوگ بڑی بیباکی سے یہ کہتے ہیں کہ ذہن و شعور مادہ ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے لہٰذا وہ زندگی کے ارتقائی تغیرات کے لیے کسی بالاتر ذہن یا ذاتِ باری کی کارفرمائی کا یقین ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ بھی

سراسر مغالطہ ہے۔ اگر اس اصول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کائنات کے کارخانہ میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی تخلیق ہے۔ وہ فطرت کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا ہے جس سے وہ جس طرح چاہتی ہے کھیلتی رہتی ہے۔ اس میں کوئی عزم اور ارادہ نہیں، وہ مادہ کے تقیدات کا اسی طرح پابند ہے جس طرح کہ جمادات۔ وہ بیشک اپنے آپ کو فطرت کے مقاصد کا نگہبان خیال کرتا ہے مگر یہ محض اس کی ابلہ فریبی ہے۔ حقیقت میں اس کا علم اور اس کے عزائم فطرت ہی کے آفریدہ ہیں اور اس لحاظ سے اس کا مقدر بھی مادہ کے بے حس ذرات کی کارفرمائی کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔ جب ہم اپنی تخلیق کی علتِ اولیٰ مادہ کو قرار دیتے ہیں تو پھر ہمیں بلا تامل یہ مان لینا چاہیئے کہ ہم فطرت کی کرشمہ سازیوں کے غیر متعلق تماشائی ہیں۔

آپ اگر مادیئین کے سامنے انسان کو اس بے بس حیثیت میں پیش کریں تو وہ فوراً کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے اور کہیں گے کہ انسان کو مجبور محض تو خدا کا تصوّر بناتا ہے، ہم تو اس کو بالکل خود مختار سمجھتے ہیں مگر یہ فریبِ نظر ہے۔ ان کے ہاں عجیب و غریب الجھن یہ پیش آتی ہے کہ وہ اپنے مقدمات کی بنیاد تو بلا تکلف مادہ پر استوار کرتے ہیں مگر ان بنیادوں پر استدلال کی جو دیواریں اٹھائی جاتی ہیں اور ان پر افکار و نظریات کے جو قصر تعمیر ہوتے ہیں انہیں یہ حضرات اپنانے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔ ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک طرف تو وہ انسانی شعور کو محض سالمات کی کرشمہ سازی سمجھتے ہیں مگر دوسری طرف اس نظریہ کو کہ انسان مجبورِ محض ہے، جو درحقیقت ان کے اپنے مقدمات ہی کا نتیجہ ہے، کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اس کے برعکس اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور جس کی پیدائش صرف سالمات کے ہاتھوں سے ہوئی ہے وہ عالمِ طبیعی اور اس کی قوتوں پر اپنے تصورات عائد کرتا ہے جو قوانین کہلاتے ہیں اور پھر اس کی مدد سے سی فطرت کو مسخر کرتا ہے جس کی وہ خود نہ صرف پیداوار ہے بلکہ جس کے ہاتھ میں ایک

کٹھ پتلی ہے اور اپنے فکر و عمل کو اسی کے اشارۂ ابرو سے متعین کرنے پر مجبور ہے ۔

یہ وہ مقام ہے جس پر قرآنِ حکیم ہمیں انسان کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ۔ وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کو بے جان اور بے حس مادہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ یہ کسی مدبّر کی تدبیر کی رہینِ منت ہے جس نے ایک خاص منصوبہ کے تحت اس کے مختلف اعضائ کے درمیان تناسب پیدا کیا اور انہیں اہلیت کے اعتبار سے مختلف فرائض سونپے ۔ پھر اسی ذات نے کیلسیم، لوہے اور کاربن کے اس پیکر میں زندگی پیدا کی اور اس طرح اسے سرگرمِ عمل کیا۔ اس کے بعد اُس نے اس کے اندر ذہن و شعور کی شمع جلائی تاکہ وہ خالقِ کائنات کی آیات کو بنظرِ غور دیکھے ۔ کانوں سے اس کے احکام کو توجہ و شوق سے سُنے ۔ دل سے انہیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر اپنے مالک کو پہچان کر اس کا شکر بجا لائے ۔

فطرت کے اشارے

آیئے اب ایک نظر ان آیات پر بھی ڈال لیں جن میں انسان کو آفاق پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ فطرت کے جمال ہی میں حُسنِ ازلی کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر انسان کو ایک خالق کے وجود کی طرف متوجہ کرتی ہے ۔ سورج کی خشمگیں کرنوں میں، نسیمِ سحر کے جھونکوں میں، چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اسے آیاتِ الٰہی نظر آتی ہیں ۔ وہ یہ باور ہی نہیں کر سکتا کہ یہ ساری کائنات جو اتنی منظم ہے، جس کے رنگا رنگ مظاہر میں ایک نہایت گہرا ربط موجود ہے، بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئی ہے ۔ یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں کروڑوں جاندار اور بے جان اشیا، یہ عِلل و اسباب کا غیر منقطع تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا حیرت انگیز نظام قدم قدم پر اپنی کرشمہ زائیوں سے انسان کے دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور انسان بالکل بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے :

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ

مناظرِ فطرت کی ان روشن آیات کے متعلق یہ احساس ہر زمانے کے ادب میں نہایت عمدہ جواہر پاروں میں ملتا ہے۔ سعدیؒ اس احساس کی ترجمانی میں یوں نغمہ سرا ہوا ہے:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ربوٹ (Ribot) نے اپنی کتاب "نفسیات جذبات" میں افریقہ کے ایک وحشی کے مذہبی خیالات نقل کیے ہیں۔ آپ ان احساسات کو ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ فطرت سے کس قدر قریب ہیں:

"بارہ برس کا ذکر ہے کہ میں اپنا گلہ چرانے کے لیے گیا۔ دھند لکا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور اپنے دل سے غم انگیز سوالات پوچھنے لگا۔ غم انگیز اس وجہ سے کہ میں ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ مَیں نے اپنے دل سے پوچھا کہ ستاروں کو کس نے بنایا ہے؟ آسمان کس ستون پر قائم ہے، دریا کے پانی کو دیکھو کہ کبھی نہیں تھمتا، بہے ہی چلا جاتا ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک بس اس کا یہی کام ہے۔ آخر یہ کہاں جا کر رُکتا ہے اور اسے کون بہا رہا ہے۔ بادلوں ہی کو دیکھو کہ آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی کبھی پانی برسا جاتے ہیں۔ آخر وہ کہاں سے آتے ہیں، انہیں کون بھیجتا ہے؟ ہمارے پجاری تو پانی برسا نہیں سکتے، اس لیے کہ میں نے کبھی انہیں آسمان پر جاتے ہوئے نہیں دیکھا، پھر آخر کون برساتا ہے؟ مَیں ہَوا کو نہیں دیکھ سکتا، لیکن آخر وہ کیا چیز ہے، اسے کون چلاتا ہے؟ ان سوالات کا جواب دل سے نہ پا کر میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا"

اسرارِ کائنات کے متعلق عقل و خرد کی یہ بے چینی جو آگے چل کر عقیدے اور ایمان پر مُنتج ہوتی ہے، صرف افریقہ کے اس وحشی ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ انسان کی ایک فطری

خلش ہے جسے دُور کرنے کے لیے ہر آدمی مضطرب اور پریشان رہتا ہے۔ پاک و ہند کا مایۂ ناز شاعر جسے زندگی میں غمِ دوراں سے کم ہی فرصت نصیب ہوئی وہ بھی فرطِ حیرت سے پوچھتا ہے ؎

لالہ و گل کہاں سے آتے ہیں ؟
ابر کیا چیز ہے ؟ ہوا کیا ہے ؟

یہ خیال فکر و احساس رکھنے والے انسان کا ایک بالکل فطری سوال ہے اور اس سوال کی بدولت ہی انسان کو حقیقت کی طرف صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اسے اگر اس کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ "لا ادری" کہہ کر چپ ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سلبی شکل ہی ہے۔

سمجھا ہے پرے تجھ کو اِدراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

اسی نوعیت کا ایک تاثر صاحبِ ہدایہ نے اپنی کتاب "تعلیم المتعلم" میں قلمبند فرمایا ہے۔ علامہ رحمتہ اللہ علیہ تعلیم و تدریس کے فطری اصولوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک فلسفی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ منطقی طرزِ استدلال کے ذریعہ وجودِ باری تعالیٰ کا کھوج لگانے سے جب اُکتا گیا تو آشفتہ سر ہو کر صحرا کی جانب نکل گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا کو آخر حکما اور فلاسفہ ہی تو نہیں مانتے، اس کی ذات پر وہ لوگ بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں زندگی میں کبھی رسمی تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ ایسے افراد اس ذات کے وجود کے لیے کیا دلائل پیش کرتے ہوں گے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں اس کے پاس سے ایک گڈریا گزرا۔ فلسفی نے اسے روک لیا اور پوچھا "کیا تم خدا کو مانتے ہو"؟ گڈریے نے جواب دیا.. "بے شک"۔ فلسفی نے دریافت کیا "اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے"؟ اس پر گڈریے نے اپنی بدویانہ زبان میں یہ کہا:

اَلْبَعْرُ يَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَالْاَثَرُ يَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ فَالْاَرْضُ ذَاتُ فِجَاجٍ وَالسَّمَآءُ ذَاتُ بُرُوْجٍ اَفَلَا تَدُلُّ عَلَى الْعَلِيِّ الْقَدِيْرِ ؟

"اونٹ کی مینگنیاں ہوں تو پتہ چل جاتا ہے کہ اونٹ گزرا ہے۔ نقوشِ پا راہ نورد کا پتہ دیتے ہیں۔ تو اب کیا یہ کشادہ راستوں والی زمین اور یہ برجوں والا آسمان ایک برتر و قادر ذات کی شہادت نہیں دیتے؟

گڈریے کے ان الفاظ میں ہر شخص خالقِ کائنات کے بارے میں انسان کے فطری سوال کا فطری جواب دیکھ سکتا ہے۔ ان میں ایک ایسی حکمت اور دانائی موجود ہے جس پر ہر سلیم الفطرت انسان کا دل خود گواہی دیتا ہے۔

قرآنِ مجید اسی طرزِ استدلال سے انسان کو حقیقت تک پہنچاتا ہے، وہ اسے بار بار اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اس کائنات میں پھیلی ہوئی آیاتِ الٰہی پر غور کرے تاکہ وہ ایک صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران ۱۹۰-۱۹۱)

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوش مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں"۔

یہ چرخ نیلی فام، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالقِ کل کا پتہ دیتا ہے اور انہیں دیکھ کر ہر شخص حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو اور آثارِ کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حٰمٓ سجدہ ۳۷

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہیں، یہ رات اور دن اور سورج اور چاند"

یہ دن اور رات کا الٹ پھیر، یہ سورج اور چاند کی روشنی اور ایک مقررہ رفتار کے ساتھ بگے بندھے پروگرام کے تحت ان کا طلوع و غروب اس بات کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام کے دوش پر کوئی سوار ہے جو اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ البقرة ۱۶۴

"جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بیشمار نشانیاں ہیں۔"

ان آیات میں خالقِ کائنات کی جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے انسانی زندگی سے ان کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق ایک صانع کے وجود کی شہادت دیتی ہے... گردشِ لیل و نہار، لاکھوں من وزنی جہازوں کا پھولوں کی طرح سطحِ آب پر تیرنا، مینہ کا برسنا اور اس سے زمین کا سیراب ہونا اور پھر اس سے انواع و اقسام کی زندگی کا نمودار ہونا سب

اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ کوئی قوتِ ناظمہ کائنات کے اس وسیع کارخانے کو بڑی حکمت اور دانائی سے چلا رہی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا۔ (الرعد ۳-۴)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں. پھر وہ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقتِ مقررہ تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے ۔۔۔۔

۔۔۔۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے ۔ اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں، اور دریا بہا دیئے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کی بیشمار دوسری نشانیوں میں ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر فلک کو قائم کر رکھا ہے ۔ اس فضائے بسیط میں اگرچہ بظاہر کوئی چیز نظر نہیں آتی جو ان بے حد حساب اجرامِ فلکی کو تھامے ہوئے ہو لیکن اگر ذرا چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ خالقِ کائنات کی اَن دیکھی طاقت انہیں اپنے اپنے مقام و مدار پر روکے ہوئے ہے اور ان سے اپنے ضابطہ کی پابندی کرا رہی ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

قرآن مجید میں اس موضوع پر اس کثرت کے ساتھ آیات موجود ہیں کہ ان سب کا

یہاں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ کلامِ پاک کی شاید ہی کوئی آیت ایسی ہو جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہ کیا گیا ہو۔ انسان کو بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مناظرِ فطرت، خوشبوئیں، روشنی اور اندھیرے کا سنجوگ، سطحِ بحر پر کشتیوں کا تیرنا، آسمانوں کا غیر مرئی سہاروں پر کھڑا ہونا سب ایک خالق اور مالک کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو پکار کر کہتا ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَى الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَى الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ (الغاشیہ-۱۸-۲۲)

"کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اونٹ کیسے بنائے گئے ہیں، آسمان کس طرح بلند کیا گیا ہے، پہاڑ کیسے جمائے گئے ہیں، فرشِ زمین کیسے بچھایا گیا ہے۔"

صانعِ حقیقی کی ہر شے اپنے حسنِ تخلیق اور حسنِ ترتیب سے خالق کے وجود کی گواہی دیتی ہے اس کی صنعت گری کے معمولی سے معمولی نمونے اور اس کی تخلیق کے بڑے سے بڑے شاہکار سب درسِ معرفت دیتے ہیں اور اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ کائنات کا یہ حیرت انگیز کارخانہ ایک ترتیب اور قاعدہ سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں کیا مجال کہ اس کارخانہ کی کوئی چیز اپنی حد سے تجاوز کر ے۔ اس کی صنعت ہر عیب سے پاک اور اس کا نظام ہر سقم سے خالی ہے۔

مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ

الملک-۳-۴

"کیا تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی معمولی سے معمولی فرق بھی دیکھتا ہے۔ پھر نگاہ کر کیا کوئی رخنہ نظر پڑتا ہے، پھر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر واپس پلٹ آئے گی۔ مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی۔"

تیسرا باب

اِسلام میں خدا کا صحیح تصوّر

مسلمان ہونے کے لئے جس کلمے کا زبان سے ادا کرنا اور دل سے اقرار کرنا ضروری ہے، وہ ہے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ اس کلمے کا پہلا جزو ایمان باللہ ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ہستی کو ماننے کے یہ معنی نہیں کہ ہم اسے محض ایک ایسی قوت تسلیم کر لیں۔ جس نے کائنات کے اوّلین سالمات کی تخلیق کی اور اس فرض کو نہایت کامیابی سے سرانجام دینے کے بعد اب وہ خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی اس ہنگامۂ خیر و شر کو دیکھ رہی ہے۔

اسلام میں خدا ریاضی کا کوئی فارمولا نہیں بلکہ ایک حیّ و قیوّم ہستی ہے جس نے نہ صرف اس کائنات کی تخلیق کی ہے بلکہ جس کا ارادہ اور مشیّت اس کے ذرّے ذرّے میں کارفرما ہے۔ وہی اس کی تنہا خالق، مالک، مُدبّر اور حکمران ہے۔ یہ سارا کارخانۂ قدرت صرف اسی کے حکم کے تابع ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی کو کوئی قدرت اور اختیار حاصل نہیں۔ وہ جو چاہے کرے کوئی اس کی راہ روک نہیں سکتا۔ قرآن مجید میں اس موضوع پر بے شمار آیات ملتی ہیں۔ ان میں سے چند ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ۔ (الرعد۔ ۳۹)	اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور ام الکتاب اُسی کے ہاتھ میں ہے۔
اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (ھود۔ ۱۰۷)	بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (المائدہ ۱:)	بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے
اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	وہ ذات جس کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے

وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان۲)

اور جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ ہی اسکی سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور پھر اُس کے لئے ایک اندازہ ٹھہرایا ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۔الکہف۔۲۶

اس کے سوا بندوں کا کوئی ولی اور سرپرست نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو اپنے فیصلوں میں شریک کرتا ہے۔

یہ سب آیات اِس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اللہ تعالیٰ اِس کائنات کا صرف خالقِ اوّل ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ اُسی کا حکم اس کائنات کے گوشے گوشے میں کارفرما ہے۔ اور کسی کی کیا مجال کہ اس سے سرِمو انحراف کر سکے۔

خداوند تعالیٰ کی حاکمیت، عظمت، اور قدرت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید ہمیں اِس حقیقت سے بھی آشنا کرتا ہے کہ اُس عظیم ذات کا ہماری زندگی کے ساتھ ایک گہرا تعلق اور رابطہ ہے۔ وہ کوئی مجرد اصول نہیں بلکہ ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو ہر لمحہ اس کائنات کی نگرانی کرتی ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (انعام-۵۹)

اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو اور زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو کچھ

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔ (بقرہ - ۲۵۵)	بندوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی الّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اُس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کیلئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ اور برتر ذات ہے۔
يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (الحدید - ۴، ۵)	جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے، سب جانتا ہے۔ اور جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو وہ اس کو دیکھتا ہے۔ آسمان اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے

مندرجہ بالا آیات پر پھر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ قرآنِ پاک کس بلیغانہ انداز میں اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب خداوند تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کے پیچھے تنہا اسی کی مشیت کام کر رہی ہے اور اس میں صرف اسی کا ارادہ کارفرما ہے یہ کائنات اور اس کے ہنگامے علت و معلول کی کرشمہ سازیاں نہیں بلکہ ایک با اختیار ہستی کی منصوبہ بندیاں ہیں۔ وہی ذات ہے جس نے علت کو علت اور معلول کو معلول بنایا ہے۔ اس لیے علت و معلول کی حقیقت بھی انسان کو اس سے زیادہ کیا معلوم کہ بقول امام غزالیؒ ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔ اس کائنات میں اصل قوت اور طاقت صرف خدا تعالیٰ کی ہے۔ وہ اگر چاہتا ہے تو علت و معلول کی کڑیوں کو جوڑ کر انسانی سعی کو کامیاب بنا دیتا ہے اور اگر اس کا ارادہ نہیں

ہوتا تو یہ سب تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور نتائج انسان کی منشا اور توقع کے بالکل برعکس برآمد ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۚ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (یونس-۱۰۷)

اگر اللہ تجھے مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے

پھر اسی حقیقت کو حضرت ہود علیہ السلام نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۞ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۚ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (ھود: ۵۵-۵۶)

تم سب مل کر اپنی چالیں چل دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت کو اور انسانی معاملات پر اس کی کڑی نگرانی کو ان الفاظ میں ادا فرمایا گیا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۶)

کہو، خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے

قادرِ مطلق اور بندے کا تعلق

گذشتہ صفحات میں ہم نے قادرِ مطلق کی جس وسیع قدرت کا ذکر کیا ہے اُس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اس کائنات میں جبریت کے قائل ہیں۔ انسانی زندگی میں بے شبہ جبر کا بھی ایک پہلو ہے۔ مگر انسان کو ایک محدود حد تک اختیار بھی دیا گیا ہے تاکہ وہ اس دائرہ کے اندر رہ کر اپنی آزادی کو استعمال کر سکے۔ انسان کی یہی آزادی دراصل اس کے شرف کی اساس ہے۔ اور اسی سے اس کے اندر ایک اخلاقی احساس جنم لیتا ہے اگر یہ حس اس میں موجود نہ ہوتی تو ایک انسان اور حیوان میں قطعاً کوئی امتیاز باقی نہ رہتا۔

ان آیات کو یہاں درج کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک کرلیں کہ قرآن مجید کی رُو سے ذاتِ باری تعالیٰ کوئی اندھا بہرہ لزوم نہیں بلکہ وہ ایک ایسی باشعور، علیم و خبیر اور زندۂ جاوید ہستی ہے جس کے ساتھ ہمارا نہایت ہی گہرا رابطہ ہے۔ ہم زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک ہر قدم پر اس کی توجہ کے محتاج ہیں۔ خداوند تعالیٰ محض تخیّل نہیں بلکہ ایک ذات ہے جس کے ساتھ ہمارا ذہنی اور قلبی دونوں طرح کا تعلق ہونا چاہیئے۔ سورۃ الشعراء میں دیکھیئے فکر و جذبہ کے کس حسین امتزاج کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السّلام بندے اور مالک کے اس باہمی تعلق کو بیان فرماتے ہیں اور پھر اس میں یہ بھی دیکھیئے کہ یہ تعلق کتنا قریبی ہے اور اس کے چشمے احساسات کی کن عمیق گہرائیوں سے اُبل رہے ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ	"(رب العالمین) جس نے مجھے پیدا کیا ہے
وَالَّذِیْ هُوَ يُطْعِمُنِیْ وَيَسْقِيْنِ	پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے، جو مجھے
وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ	کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا
يَشْفِيْنِ وَالَّذِیْ	ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے
يُمِيْتُنِیْ ثُمَّ	موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی

يُحْيِيْنِ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (الشعرا ۸۱-۸۲)

بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دیگا۔"

خدا اور بندے کے اس باہمی تعلق کی قرآن مجید مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے وضاحت فرماتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اس کا ارشاد یہ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۔ (ق - ١٦)

"ہم نے انسان کو پیدا کیا اور جو باتیں اس کے جی میں آتی رہتی ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔"

ایک دوسرے مقام پر وہ اس تعلق کو یوں بیان کرتا ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۔

(البقرہ - ١٨٦)

"اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔"

پھر سورۂ نمل میں ایک نہایت لطیف پیرائے میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ خالقِ کائنات ایک لطیف و خبیر ہستی ہے جو نہ صرف ہمارے دلوں کے اسرار کو جانتی ہے بلکہ ہماری ذہنی کیفیات اور قلبی واردات سے بھی پوری طرح واقف ہے اور جب ہم مضطرب اور پریشان ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ ہمارے اس اضطراب کو پوری طرح محسوس کرتی ہے اور اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت اسے اطمینان سے بدل دیتی ہے۔ یہاں قرآن مجید استفہامیہ انداز اختیار کر کے اس حقیقت کو

یوں ذہن نشین کراتا ہے :

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ — "کون ہے جو بے قرار ہوکر پکارنے والے کی دعا سنتا ہے اور اس کی مصیبت ٹال دیتا ہے۔"

قرآن مجید اور احادیث کے مختلف مجموعوں میں جو دعائیں منقول ہیں ان پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے انسان صرف اسی کے در کا گدا، اسی کے آستان کا سوالی، اسی کی رحمت اور بخشش کا امیدوار اور اسی کے فضل کا محتاج ہے۔ انسان جب اس کے سامنے اپنا دامن پھیلا کر مانگتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کسی بے جان تصور کے سامنے دستِ سوال دراز کر رہا ہے بلکہ وہ اس یقین کے ساتھ خدا سے سوال کرتا ہے کہ وہ ایک زندۂ جاوید ہستی ہے۔ اس کی رحمت بے پایاں اور اس کے خزانے بے حد و حساب ہیں۔ وہ ہماری پکار سنتا ہے اور جو کچھ ہم اس سے طلب کرتے ہیں وہ اگر اسے ہمارے حق میں نافع سمجھتا ہے تو اس سے ہمیں نوازتا ہے اور بسا اوقات ہماری طلب سے کہیں بڑھ کر ہمیں دیتا ہے۔ ہمارے اور اس ذات کے درمیان جو رشتہ موجود ہے اسے علت و معلول کی بے جان کڑیوں نے ترتیب نہیں دیا بلکہ رحمت اور مودت کے لطیف تاروں سے یہ تعلق استوار ہوا ہے۔ آپ قرآن مجید اور حدیث کی چند دعائیں ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ احساسِ بندگی اطاعت اور فرمانبرداری کے علاوہ کس قدر دل آسا، خیال انگیز اور دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جو جذبات اور درد و شوق کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور وہ کس جذب و شوق کے ساتھ اپنے خالق اور مالک کی طرف رجوع کرتا ہے :

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ - آل عمران : ۱۹۴ — "اے ہمارے رب تو ہمیں وہ عطا کر جس کا اپنے رسولوں کی معرفت تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن

(آل عمران-۱۹۴)

رسوانہ کر، تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔"

اَنْتَ وَلِيُّنَا، فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ

"اے اللہ تو ہمارا کارساز اور مددگار ہے بس ہمیں صحت بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے۔"

(اعراف ۱۵۵)

رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۔ بنی اسرائیل ۸۰

"پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک قوت کو میرا مددگار بنا دے۔"

حضور سرور کائنات سے جو دعائیں مروی ہیں ان کو دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے خود بخود یہ نقشہ ابھر آتا ہے کہ خالق کا ایک عاجز بندہ اپنے ایک زبردست قدرت کے رکھنے والے مولا سے اس امید کے ساتھ مانگ رہا ہے کہ اس کے دروازے سے آج تک کبھی کوئی ناکام نہیں لوٹا۔ بندہ قلبی اضطراب کے ساتھ مانگتا ہے تاکہ مالک الملک اسے مضطرب دیکھ کر اس پر رحم فرمائیں۔ وہ اس کے سامنے سر نیاز خم کر کے اس سے طلب کرتا ہے کیونکہ اس ذات کے علاوہ اس کائنات میں وہ کسی دوسری ہستی کو حاجت روا نہیں مانتا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ان تمام مناجات کو نقل کیا جا سکے۔ ہم صرف دو دعائیں نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک مومن صادق کو اپنے خالق اور مالک کے ساتھ کس قسم کا تعلق خاطر قائم کرنا چاہیئے اور اس ذات کے بارے میں اس کے احساسات اور جذبات کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے:

اللھم انک تسمع کلامی وتری مکانی وتعلم سری وعلانیتی

"اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، تو میرے پوشیدہ اور ظاہر دونوں سے واقف ہے، تجھ سے میری

لا يخفى عليك شي من
امري وانا البائس الفقير
المستغيث المستجير
الوجل المشفق المقر
المعترف بذنبي اسالك
مسئلة المسكين
وابتهل اليك ابتهال
المذنب الذليل وادعوك
دعاء الخائف الضرير
ودعاء من خضعت
لك رقبته وفاضت
لك عبرته وذلّ لك
جسمه ورغم لك انفه اللهم
لا تجعلني بدعائك
شقيًا وكن بي روفاً رحيما ياخير
المسئولين ويا خير المعطين۔
اللهم اليك اشكو ضعف
قوتي وقلة حيلتي وهواني
على الناس يا ارحم الراحمين
الى من تكلني الى
عدو يتجهمني او الى

کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں تو مصیبت
زدہ محتاج فریادی ہوں۔ ترساں و ہراساں
اور اپنے گناہ کا اقرار کرنے والا ہوں۔ میں
ایک بے کس کی طرح تیرے سامنے دستِ
سوال دراز کرتا ہوں اور ایک ذلیل گنہ گار
کی طرح تیرے سامنے گڑگڑاتا ہوں اور ایک
خوف زدہ اور آفت رسیدہ کی طرح تجھ
سے طلب کرتا ہوں۔ وہ جس کی گردن تیرے
حضور میں جھکی ہوئی ہے جس کے آنسو بہہ
رہے ہیں، جو تیرے سامنے فروتنی کیے ہوئے
ہے۔ اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑتا ہے۔
بارالٰہا! مجھے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور
میرے حق میں رحمت اور شفقت اختیار
کر، اے ان سب سے بہتر جن سے مانگا
جائے اور عطا کرنے والوں میں سب سے
ارفع و اعلیٰ ذات۔"

"بارالٰہا! میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنے
کمزور ہونے کی، ساز و سامان کی قلت کی،
اور لوگوں کی نظر میں کم وقعتی کی۔ اے سب
سے زیادہ رحم کرنے والے تو مجھے کس کے سپرد
کرتا ہے؟ کسی دشمن کے کہ مجھ سے سینہ زوری

قریب ملّکتہ امری - ان لم تکن ساخطا علیّ فلاابالی غیران عافیتک اوسع لی

کرے اور مجھے ستائے یا کسی عزیز کے کہ جس کے سپرد میرے سب کام کر دیئے جائیں اگر تو ناراض نہ ہو تو مجھے کچھ پروا نہیں مگر پھر بھی تیری عافیت میں میرے لیے زیادہ فراخی ہے۔"

آپ ان مناجات کو بار بار پڑھیں اور دیکھیں کہ یہ احساسات کس توکل، ورع، خشیت، عجز و انکسار اور رقتِ قلب کے آئینہ دار ہیں اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ خداوند تعالیٰ سے مانگنے والا گو اپنے آپ کو اس کے سامنے بالکل حقیر پاتا ہے مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں اس مالک اور خالق کی قربت کا کس قدر شدید احساس بھی موجود ہے۔ اسے اس کی رحمت پر کتنا غیر معمولی بھروسہ ہے۔ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہو کر، اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہے۔ کیا اس قسم کے احساسات کسی تصور یا نظریہ یا فارمولا کے متعلق بھی پیدا ہو سکتے ہیں؟

خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے بارے میں ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم قوانینِ فطرت کے اندر کوشش اور جد و جہد کو عبث اور بیکار سمجھتے ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ مسلمان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہماری ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگرچہ انسانوں کو زندگی کے سارے میدانوں میں جد و جہد کرنی چاہیئے مگر اس سعی و جہد کے ثمرات کے لیے صرف مشیتِ ایزدی پر اعتماد لازمی ہے۔ ہم یقیناً گمراہ ہوں گے اگر اپنی ساری کوشش صرف علت و معلول کی کڑیاں جوڑنے صرف کرتے رہیں اور اس علت العلل اور اس مسبّب الاسباب سے کوئی تعلق استوار کرنے کی فکر نہ کریں جو ان کے اندر ربط پیدا کر کے ہماری سعی و جہد کو بار آور کرتا یا ہماری کوششوں کو اپنی حکمت بالغہ کے تحت ہماری نظر میں ناکام بنا دیتا ہے۔

جس شخص کی نظر اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر ہو اور جو اس بدیہی حقیقت

کو دل وجان سے قبول کرے کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ سب اسی ایک ذات کی کرشمہ سازی ہے اور اسی ایک کا ارادہ اور اختیار سب پر حاوی ہے اور مدبر الامر وہی ہے تو وہ بالکل فطری طور پر دنیا کے مال ومتاع کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو ایک دنیا پرست دیتا ہے۔ اس لیے وہ مادی حالات کی موافقت یا نامساعدت دیکھنے کے بجائے اس بات کو معلوم کرنے کی فکر کرتا ہے کہ کیا اس کا خالق ومالک اس سے راضی ہے یا نہیں۔ جب اسے ایک بار اس امر کا یقین ہو جائے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی رضا اور منشا کو پورا کر رہا ہے، تو نہ وسائل واسباب کی کمی اس کے حوصلوں کو پست کرتی ہے اور نہ مخالفتوں کا سیلاب ہی اس کے بازوؤں کو شل کرتا ہے۔ وہ دنیا کی اس رزم گاہ میں بے تیغ بھی لڑ جانے کی جرأت رکھتا ہے۔ وہ بڑے بڑے جباروں اور قہاروں کے مقابلے میں اس بے باکی سے اترتا ہے جیسے کہ ان کی حیثیت اس کے نزدیک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں۔ وہ آگ کے الاؤ میں اس اعتماد کے ساتھ کودتا ہے کہ خود اس کی اپنی عقل بھی اس کی اس جسارت پر حیران وششدر رہ جاتی ہے۔ وہ بڑے بڑے ہولناک حالات میں گھر کر بھی اس طرح پُر سکون اور مطمئن رہتا ہے گویا کہ اس کے سامنے کچھ ہے ہی نہیں۔ اس کی راہ میں نہ تو صحراؤں کی وسعتیں حائل ہوتی ہیں، نہ پہاڑوں کی بلندیاں۔ وہ سمندر کی موجوں سے بڑی بے پروائی کے ساتھ کھیلتا ہے غور کیجئے کہ آخر اس جرأتِ رندانہ، اس زبردست اعتماد اور اس لازوال اطمینان کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اس راز سے پوری طرح آشنا ہے کہ یہ سب چیزیں اس کے آقا کے اسی طرح اختیار میں ہیں جس طرح کہ خود اس کی اپنی جان ہے۔ وہ جب چاہتا ہے چشمِ زدن میں سمندر کا سینہ چاک کر دیتا ہے۔ وہ بڑے بڑے لشکروں کو چڑیوں کے غول بھیج کر تباہ کروا دیتا ہے اور جب ارادہ کرتا ہے تو صنم خانوں سے کعبہ کے پاسباں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دنیا کے سارے اسباب ووسائل تنہا اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور ان سب پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو ماحول کی سازگاری دیکھنے کے بجائے اپنے مالک کو راضی

کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیئے ۔ وہ اگر راضی ہے تو پھر سارے جہاں کی مخالفت بھی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتی اور اگر وہ ناراض ہے تو پھر اس دنیا کے سارے اسباب اس کے کسی کام نہیں آسکتے بلکہ اس کے لیے مضر اور نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ اصل وجہ ہے کہ ایک مسلمان مال و متاع جمع کرنے کے بجائے اپنے مالک کی رضا ڈھونڈتا ہے اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ قرآنِ پاک اس حقیقت کو کس طرح ذہن نشین کراتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر تعلیماتِ الٰہی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس نے ذہنِ انسانی میں اس تصور کی آبیاری کرنے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔

وہ سب سے پہلے مثبت طور پر انسان کے دل میں اس خیال کو راسخ کرتا ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا پروردگارِ عالم ہے اور یہاں صرف اسی کا حکم چلتا ہے:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ

(الاعراف - ۵۴)

"درحقیقت تمہارا رب وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تختِ سلطنت پر متمکن ہوا جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو، اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر۔"

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي

"وہ ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کی سلطنت میں کوئی اس کا

الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان - ٢)

شریک ہے۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھیرا دیا ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا - (الکہف ٢٦)

اس کے سوا بندوں کا کوئی ولی و سرپرست نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔"

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (المومن ١٢-١٣)

" حکم اسی اللہ کا ہے جو بزرگ و برتر ہے وہی تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔"

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ - (الزمر - ٤٤)

" آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کی ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔"

یہ سب آیات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ اسی کا حکم اس کائنات کے گوشے گوشے میں چلتا ہے اور اسی مشیت اور ارادہ کے تحت یہاں سب کچھ ہو رہا ہے۔

اس بات کو ذہن نشین کرانے کے بعد کہ اس دنیا میں صرف خالقِ کائنات ہی ہر چیز کا مالک و مختار ہے اور اسی کا حکم سب پر حاوی ہے۔ قرآن پاک اپنے ماننے والوں سے اِس چیز کا مطالبہ کرتا ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں صرف اسی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کریں۔ جب ہم اس معاملہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ دراصل اللہ پر ایمان کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے۔ جب ایک شخص یہ مان لے کہ اس کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے قبضۂ قدرت میں زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز تو اس کے اس ایقان کا بالکل قدرتی تقاضا یہ ہے کہ وہ تنہا اسی ذات پر توکل کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ (الفرقان) ٥٨

" اسی زندہ ہستی پر بھروسہ کر جس کو موت آنے والی نہیں ہے۔"

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ - اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِىْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ -

(آلِ عمران ۱۶۰)

"جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو۔ پس ایک ایمان دار کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے"۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

(اطلاق: ۱)

"جو اللہ پر بھروسہ کریگا تو وہ اس کو کافی ہوگا"۔

نبیٔ اکرمؐ سے جو دعائیں مروی ہیں وہ بھی اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ حضور ذاتِ باری تعالیٰ پر بھروسے اور اعتماد کو ایمان کا جزوِ لاینفک سمجھتے تھے۔ سرکارِ دوعالمؐ کی لاتعداد دعائیں انہی احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان رسول اللہؐ کان يقول - اللهم لك اسلمت وبك آمنت وعليك توكلت و اليك انبت واليك خاصمت ، اللهم اعوذ بعزتك لا اله الا انت ان تضلنى، انت الحى الذى لا تموت والجن والانس يموتون

"اے اللہ میں نے تیرے ہی سامنے سر جھکایا اور تجھی پر ایمان لایا اور تیرے ہی اوپر بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور تیری ہی خاطر جھگڑا کیا۔ اے اللہ میں تیری عزت کی پناہ چاہتا ہوں، کوئی معبود تیرے سوا نہیں۔ تو مجھے بھٹکتا نہ چھوڑ دے تو زندہ ہے کبھی نہ مرے گا، جن اور انسان سب مر جائیں گے"۔

اسی طرح سونے کے وقت کی دعا بھی اسی قسم کے جذبات سے لبریز ہے۔

حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

جب اپنے بستر پر آؤ تو کہو:

اللهم اسلمت نفسی الیك ووجهت وجهی الیك، وفوضت امری الیك والجات ظهري اليك رغبةً ورهبة اليك لَامَلْجَا وَلَامَنْجَامِنْكَ اِلَّآ اِلَيْكَ۔

اے اللہ میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالہ کر دیا اور اپنا رُخ تیری طرف موڑ لیا، اور اپنا معاملہ تیرے سپرد کیا۔ اور اپنی پیٹھ تیرے سہارے لگا دی، میری رغبت بھی تیری ہی طرف ہے اور خوف بھی تجھی سے ہے۔ تیری پکڑ سے بچنے کے لیے تیرے ہی دامن کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں"۔

عن عمر رضی الله عنہ قال سمعت رسول الله صلی الله علیہ وسلم یقول لو انکم تتوكلون على الله حق توكّله لرزقكم كما يرزق الطير، تغدو خماصًا وتروح بطانًا

(ترمذي)

"حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر تم اللہ پر بھروسہ کرو جیسا اس پر بھروسہ کرنے کا حق ہے تو تم کو وہ اسی طرح رزق دے گا جیسے چڑیوں کو دیتا ہے، صبح کو خالی پیٹ جاتی ہیں، اور شام شکم سیر واپس آتی ہیں"۔

قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر اس امر کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ ایک مومن و مسلم کے لیے حالات کی سازگاری یا ناسازگاری کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ حالات بظاہر کس قدر نامساعد ہی کیوں نہ ہوں لیکن جب خالقِ کائنات ان کو بدلنے کا ارادہ کر لے تو پھر وہ مؤید اور معاون بن جاتے ہیں۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کا جو واقعہ سورۃ الشعراء میں بیان کیا گیا ہے وہ اس حقیقت پر پوری طرح دلالت کرتا ہے جب حضرت موسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر اپنے ملک سے نکلے تو ان کے تعاقب میں فرعون کی فوجیں بھی بھاگتی

ہوئی آگئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ گھبرا اٹھے اور کہا: اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ "ہم تو پکڑے گئے"۔ لیکن ان کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے جو خداوند تعالیٰ پر اعتماد کی لازوال نعمت سے مالا مال تھے بڑے اطمینان سے فرمایا:

"ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے

جو مجھے راہ بتلائے گا"۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے اعتماد کو پورا کر دکھایا جس کی تفصیل قرآن مجید نے یوں بیان فرمائی ہے:

فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ‌ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٍ كَالطَّوۡدِ الۡعَظِيۡمِ‌ۚ وَاَزۡلَفۡنَا ثَمَّ الۡاٰخَرِيۡنَ‌ۚ وَاَنۡجَيۡنَا مُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗۤ اَجۡمَعِيۡنَ‌ۚ ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِيۡنَ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً‌ ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ
(الشعراء ۶۳-۶۸)

"پھر ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا سمندر پر مار۔ پس سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا اس طرح ہو گیا جیسے ایک بڑا پہاڑ کھڑا ہو۔ اور ہم اسی جگہ دوسروں کو لے آئے، موسیٰ اور اس کے سب ساتھیوں کو بچا نکالا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہ تھے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

اسی سلسلہ میں دوسرا واقعہ جو قابلِ غور ہے وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ہے۔ جب حضورؐ مکہ سے مدینہ تشریف لے جاتے ہوئے غارِ ثور میں پناہ گزین تھے تو دشمن عین غار کے سر پر آگئے۔ اس حالت پہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی سخت خوف لاحق ہوا اور وہ سوچنے لگے کہ اگر ان ظالموں میں سے کسی نے ذرا آگے بڑھ کر غار میں جھانک لیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ اس موقع پر اُس ذاتِ مقدس نے بڑے سکون اور اطمینان سے کہا:

لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ ۴۰) "ڈرو نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

اسی واقعہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کی زبان فیض ترجمان سے یوں نقل فرمایا ہے:

نظرت الی اقدام المشرکین ونحن فی الغار وھم علیٰ رؤسنا فقلت یا رسول اللہ لو ان احدھم نظر تحت قدمیہ بصرنا فقال ماظنک یا ابابکر باثنین اللہ ثالثھما (بخاری مسلم)

"میں نے مشرکین کے قدم دیکھے۔ ہم غار میں تھے اور وہ ہمارے سروں پر۔ میں نے کہا یارسول اللہؐ اگر ان میں ایک شخص بھی اپنے قدموں کی طرف دیکھے تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے ابوبکرؓ! تم ایسے دو کے متعلق کیا گمان کرتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ اس سب سے بڑی کامیابی اور کامرانی پر جو مسلمانوں کو جنگ بدر میں حاصل ہوئی، یہ ذہن نشین کراتا ہے کہ اس کامرانی میں تمہاری کسی تدبیر کا دخل نہ تھا بلکہ یہ محض اسی کے فضل سے ہوا کہ تمہیں ایسی شاندار فتح سے نوازا گیا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(آل عمران ۱۲۲، ۱۲۳)

"یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ کمزوری دکھانے پر آمادہ ہوگئے تھے حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا۔ اور مومنوں کو اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ آخر اس سے پہلے جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرچکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکرگزار بنو گے۔"

مندرجہ بالا آیت میں خداوند تعالیٰ نے بڑے ہی لطیف پیرائے میں مسلمانوں کی توجہ

اس طرف مبذول کرائی ہے کہ تمہیں جب بھی کسی میدان میں فتح اور کامیابی نصیب ہو تو تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ یہ تمہاری ذاتی کوششوں اور محنتوں کا ثمر ہے بلکہ تمہیں ہمیشہ اس امر کا احساس رہنا چاہیئے کہ اس دنیا میں جو فضل تم پر کیا جاتا ہے وہ محض تمہارے خالق اور مالک کا انعام و اکرام ہے۔ اس لیے تمہیں اپنی کامیابی پر اترانے کے بجائے مالک کے حضور میں شکر بجا لانا چاہیئے اور تم جتنا زیادہ اس کے شکر گزار ہو گے وہ اسی تناسب سے تم پر نوازشات کی بارش کرتا رہے گا۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (البقرہ ٦٤)

"پس اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔"

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الفاطر - ۲)

"جو کچھ رحمت بھی اللہ تعالیٰ لوگوں پر کھول دے کوئی اس کو روکنے والا نہیں اور جو کچھ وہ روک رکھے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی جاری کرنے والا نہیں۔ اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔"

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔ (ابراہیم - ۷)

"اور یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو تمہیں اور بھی دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ شدید ہے۔"

معاملہ پھر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ خداوند تعالیٰ نے مایوسی اور قنوطیت کو ایمان کی عین ضد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ جو لوگ ان بیماریوں میں مبتلا ہیں وہ چاہے زبان سے یہ بات نہ کہیں مگر حقیقت میں ان کا بھروسہ یا تو اپنی قوتوں پر ہے یا ان کے نزدیک ان کا خدا بالکل مجبور اور بے بس ہے۔ جس کا مادی حالات کے سامنے کوئی زور نہیں چلتا۔ یا پھر

وہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنی رحمت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اس قسم کے خیالات صرف اسی شخص کے ذہن میں آسکتے ہیں جو یا تو خدا کو ایک با اختیار اور با جبروت ہستی نہیں مانتا یا وہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق ایک نہایت ہی تاریک تصور رکھتا ہے:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ — "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔"

اسی مضمون کو سورۃ الحجر میں ابراہیم علیہ السلام کے قصّہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب بڑھاپے میں بیٹے کی بشارت دی گئی تو آپ بظاہر اس ناممکن بات پر سخت حیران ہوئے اور کہا:

اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰٓی اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنِ ۔ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ ۔ قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ

(الحجر ۵۵-۵۷)

"(ابراہیمؑ نے کہا) کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ (ذرا سوچو تو سہی کہ) یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا۔" ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں۔ تم مایوس نہ ہو" ابراہیم نے کہا۔ اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔"

سورۂ یوسف میں اسی ناامیدی کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائی کی تلاش میں بھیجتے ہیں تو ان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

(یوسف ۸۷)

"میرے بچو! جا کر یوسف اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"

یہ سب آیات جو پچھلے صفحات میں درج کی گئی ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ایک خدا پرست انسان کو، جو ایک زندہ، جاوید اور صاحبِ اختیار خدا پر ایمان رکھتا ہے، کبھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اس کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ ہر حال میں نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر، اپنے مولا اور آقا پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے منشا کو پورا کرنے کی فکر کرے۔ جس ذات کی بندگی اور اطاعت کو وہ اپنی زندگی کی غایتِ اولیٰ سمجھتا ہے وہ علیم وخبیر ہے، بے پناہ قوت اور طاقت کی مالک ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے۔ وہ ذات اسے ایسے راستوں اور طریقوں سے مدد بہم پہنچائے گی کہ ان کے بارے میں اسے کبھی وہم وگمان بھی نہ ہوا ہوگا۔ ایک منکرِ خدا جب ماحول کی ناسازگاری دیکھ کر مایوس ہوتا ہے تو اس کی اس کیفیت کی وجہ تو سمجھ میں آسکتی ہے جو شخص ناپائیدار دنیا اور اس کے اسباب ووسائل کو اپنا معبود سمجھ بیٹھا ہو وہ اگر کسی وقت یاس وقنوط کا شکار ہو جائے تو بالکل فطری چیز ہے لیکن اس چیز کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک انسان خدائے لم یزل پر ایمان کا دعویٰ بھی کرے مگر اس کے ساتھ ساتھ حالات کی نامساعدت دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے۔ وہ ایک طرف ایسی ہستی کے وجود کا زبان سے اقرار بھی کرے جو ہر قسم کی حسن وخوبی کا سرچشمہ ہے، ہر کمال کی خالق ہے، سارے موجودات کی مالک اور حاکم ہے، جس کے قوانین اٹل، جس کے ضابطے بے لاگ اور جس کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے، مگر دوسری طرف اپنی زندگی میں اصل اور فیصلہ کن چیز دنیاوی مال ومتاع کو سمجھے۔ یہ دورنگی ایک مسلمان کو کسی طرح زیب نہیں دیتی۔ ایک مومن ومسلم کے لیے زندگی گزارنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کی مدد پر بھروسہ رکھے اور ہر کام کو اس احساس کیساتھ شروع کرے۔

حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ

"میرے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر وہ، اسی پر میں نے بھروسہ

الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ - (التوبہ ۱۲۹)	کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔"
أُفَوِّضُ أَمْرِيْ إِلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ - (المومن ۴۴)	" میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ بیشک وہ بندوں پر نگاہ رکھنے والا ہے اور
وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ إِلَّا بِاللّٰهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ ہود - ۸۸	جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے اسی پر میرا بھروسہ ہے اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

افوض امری الی اللہ ان اللہ

چوتھا باب

خدا اور رسولؐ کی محبت کے تقاضے

کسی شے، فرد، عقیدہ یا نصب العین سے وابستگی کا ایک ہی معیار ہے کہ انسان اس کے لیے کس قدر ایثار کر سکتا ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اپنے خالق اور مالک کی بندگی، اس کے رسول کی غلامی اور اس کے دین کی خدمت اور چاکری کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ سخت کٹھن اور دشوار راستہ ہے۔ اس راہ میں انسان کو ہر طرح کے مصائب پیش آتے ہیں، اسے ہر طرح کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور اسے ہر طرح کے شدائد سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ

(البقرہ - ۲۱۴)

"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ درآنحالیکہ (ابھی) تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ انہیں تنگی اور سختی پیش آئی اور انہیں ہلا ڈالا گیا یہاں تک کہ پیغمبر اور جو لوگ انکے ہمراہ ایمان لائے تھے پکار اٹھے کہ اللہ کی امداد (آخر) کب آئیگی۔ سن رکھو اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے۔

مشہور مُفسر امام فخرالدین رازی نے باساء اور ضراء میں جو لطیف فرق ہے اسے بیان فرماتے ہوئے کہا ہے کہ پہلے میں راحت اور آسائش کے فقدان کا پہلو نمایاں ہے اور دوسرا درد و اذیت کو ظاہر کرتا ہے یعنی ایمان لانے کے بعد نہ صرف انسان کو اپنے آسائش و آرام سے محروم اور دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ اُسے اللہ کی راہ میں دُکھ بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کے معنی

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے مختلف مظاہر اور دائرے ہیں۔

اس کا سب سے پہلا مظہر وہ قلبی کیفیت ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم بھرنے والوں کو خداوندِ لم یزل پر غیر متزلزل یقین اور ایمان ہونا چاہیئے۔ اگر اُسے باری تعالیٰ کے وجود، اس کی صفات، اس کے ساتھ عہد و پیمان اور اس کے وعدوں پر یقین نہ ہوگا تو وہ محبت کے دعویٰ میں کبھی سچا اور مخلص نہیں مانا جا سکتا۔ جس ذات کے ساتھ گہری وابستگی کے آپ دعویدار ہیں سب سے پہلے اس پر بھروسہ ضروری ہے اسی حقیقت کو قرآنِ حکیم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات-۱۵)

"بیشک مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے پھر (اس میں) کبھی شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو یہی لوگ راست باز ہیں۔"

ایمان کی پہلی منزل اپنے قلب و دماغ کو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک کرنا ہے۔ ریب و تشکیک ایمان کی ضد ہے۔ جس دل میں شکوک کے جھاڑ جھنکاڑ موجود ہوں اس میں ایمان کی فصل کبھی نہیں اُگ سکتی۔ ایمان جو امن سے مشتق ہے اس کے اصل معنی بقول امام راغب نفس کے مطمئن ہونے اور خوف کے دُور ہونے کے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اس سے

مراد وہ تصدیق ہے جس سے اطمینان حاصل ہو جائے اور کوئی تردد باقی نہ رہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہود کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (النسآء - ۱۵)	"کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ وہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔"

یہاں یُؤْمِنُوْنَ کا لفظ بطور طنز استعمال کیا گیا ہے اور ان کے فہم و فراست کی مذمت کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ گمراہ لوگ ایسی بیکار چیزوں سے اطمینان حاصل کرنیکی کوشش کرتے ہیں جو کبھی باعثِ اطمینان نہیں ہو سکتیں۔ (امام راغبؒ)

ایمان کامل یکسوئی، دل و دماغ کے مکمل اطمینان اور یقینِ محکم کا نام ہے اور اگر کوئی شخص یہ کیفیت پیدا نہیں کر سکا تو وہ حلاوتِ ایمانی سے محروم ہے۔ ایمان کے معنی ہی یہی ہیں کہ انسان تمام اطراف سے نفع کی امید اور نقصان کا خوف ہٹا کر صرف اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کے دین کے ساتھ وابستگی پیدا کرے۔ اس کے نزدیک اللہ کی رضا، اس کے رسولؐ کی محبت اور اس کے دین سے تعلقِ خاطر دنیا کے ہر دوسرے تعلق، دنیا کے ہر دوسرے رشتے پر فوقیت رکھتا ہو، بلکہ دنیا کا ہر دوسرا تعلق اس ایک تعلق پر بادنیٰ تامّل قربان کیا جا سکتا ہو۔ اگر بھلائی کی تلاش ہو تو اُسے اللہ اور رسولؐ کی محبت اور انکی اطاعت اور اس کے دین کی پیروی میں تلاش کیا جائے۔ اگر نقصان اور زیاں کا خوف لاحق ہو اور اس سے بچنے کی آرزو ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اس کے خالق و مالک نے کن چیزوں کو ضرر رساں قرار دیا ہے اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے کیا تدابیر بتائی ہیں۔ اگر انسانوں کے ساتھ روابط قائم کرنا مقصود ہو تو اس معاملے میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام ہی کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ الغرض ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی پوری توجہ اور اس کی ساری فکری اور

جسمانی صلاحیتیں قطب نما سوئی کی طرح صرف ایک رُخ پر لگی رہیں۔ ہم روزمرہ زندگی میں جو لفظ "اعتقاد" بولتے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ ساری اطراف کو جمع کر کے گرہ باندھ دی جائے یعنی انسانی فکر و عمل کے سارے گوشے اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت اور اطاعت کے مرکز پر سمٹ کر قائم رہیں اور حیاتِ انسانی کا ہر گوشہ اور ہر شعبہ اس ایک ہی مرکز سے مستنیر ہو۔ انسان کو اپنے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے اسی ایک مرکز سے سامان فراہم ہو۔ اسے اپنی معاشی فلاح، اخروی نجات، معاشرتی عدل و انصاف، سیاسی استحکام اور اسی نوعیت کے دوسرے معاملات میں اسی سرچشمۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل ہو اور اس کے اندر کسی دوسری سمت نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی خواہش تک پیدا نہ ہو۔ اس حقیقت کی طرف حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں اشارہ فرمایا ہے:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًا و بالاسلام دینًا و بمحمدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) رسولًا۔ (مسلم)

"اس شخص نے فی الحقیقت ایمان کا مزا چکھا، جو خدا کی خدائی پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دل و جان سے مطمئن ہو گیا۔"

اور حلاوتِ ایمانی کو دو لفظوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کہا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور اس کے دین سے محبت میں یکسوئی ایک مثبت اور ایجابی کیفیت کا نام ہے جو منفی اور سلبی رجحانات کی نفی کرنے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح معبودِ حقیقی کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کرنے کے لیے معبودانِ باطل کا ابطال ضروری ہے اسی طرح اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان ایمان کے تقاضوں کے مقابلے میں باقی سارے مفادات یکسر نظر انداز کر دے۔ ایمان اور عقیدہ خدا کے ساتھ کوئی نیم دلانہ اور عارضی وابستگی نہیں بلکہ یہ ایک نہایت مضبوط، گہرے، پائیدار اور ہمہ گیر تعلق کا نام ہے جس کی چوکھٹ پر باقی سارے تعلقات کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ انسان جب تک اپنے قلب و دماغ

سے چھوٹے خداؤں کی محبت پوری طرح محو نہ کر دے اس وقت تک خدائے واحد پر ایمان کی شمع نہیں جلائی جا سکتی۔ اللہ اور اس کے رسولؐ سے ایک ایسی محبت ہونی چاہیے جس کے مقابلے میں دنیا کے سارے تعلقات، سارے رشتے اور علائق بالکل ہیچ ہوں۔ قرآنِ مجید نے اس محبت کا معیار مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ (توبہ ۲۴)

"اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، عزیز و اقارب اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے، خدا اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔"

اس آیت سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے مال و جان، برادری، اولاد، صنعت و تجارت، آرام و آسائش کو راہِ خدا میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور دنیا کا کوئی عزیز رشتہ اور قیمتی سے قیمتی متاع اس کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔

ایک مومن کا سینہ عشقِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ سے کس طرح معمور ہوتا ہے؟ اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے اور ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حُبِّ الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان ہی کو نصیب ہوتی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ

"اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں۔ ان سے

كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ ۱۶۵)

ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے رکھنی چاہیئے حالانکہ اہلِ ایمان تو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔"

ایمان کے بعد اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے۔

چنانچہ جو لوگ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (مائدہ - ۵۴)

"مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دینِ اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا جنہیں وہ محبوب رکھے گا اور وہ اس کو محبوب رکھیں گے۔"

اللہ تعالیٰ سے محبت کوئی بے حس کیفیت نہیں جس سے انسان کے قلب و دماغ میں کوئی تلاطم برپا نہ ہوتا ہو۔ محبت ایک نہایت ہی حساس اور انقلاب انگیز کیفیت ہے جو ایک طرف انسانی جذبات کی اتھاہ گہرائیوں کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے اور دوسری طرف اس کے فکر و عمل میں غیر معمولی تبدیلیاں لاتی ہے۔ وہ محبت جو قلب میں سوز، اللہ کی راہ میں اطاعت اور جاں نثاری کا جذبۂ صادق، احکامِ الٰہی کی پابندی کے لیے جوش اور ولولہ، اللہ کے دین کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کی شدید آرزو اور اس جدوجہد میں مصائب اور تکلیفات اٹھانے کا عزم پیدا نہیں کرتی وہ محبت نہیں بلکہ بے مروّتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ الٰہی کی شمع روشن ہو مگر وہ ایمان کی حرارت اور سوزِ یقین سے خالی رہے اور اس کی زندگی کے سارے گوشے اس نورِ ایمانی سے تابندہ اور درخشاں نہ ہوں۔ . . . اللہ سے محبت کرنے والے کی دلی کیفیات کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ

"جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسولؐ پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے

مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ۞ وَمَا لَنَا لَا نُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الۡحَقِّ المائدہ - ۸۳ - ۸۴

ان کی آنکھیں بہنے لگتی ہیں۔ وہ بول اُٹھتے ہیں کہ پروردگار! ہم ایمان لائے۔ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے اور وہ کہتے ہیں) کہ کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں۔"

یہ آیات حق پسند اور حق پرست لوگوں کی دلی کیفیات کی پوری طرح ترجمان ہیں۔ اللہ سے محبت کرنے والے اس کے پیغام کو بے توجہی سے نہیں سنتے بلکہ اُسے ارشادِ ربانی سمجھتے ہوئے اس کی پوری عظمت کو قلب و دماغ میں رکھتے ہوئے قبول کرتے ہیں۔ پھر یہ پیغام ان کے دل کے کسی گوشے میں ایک بھولی بسری داستان کی حیثیت سے نہیں پڑا رہتا بلکہ وہ انہیں شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ اس سے ان کے دل کی دنیا بدل کر رہ جاتی ہے۔ ان کے اندر اپنے مرتبہ ومقام کو جاننے، اپنے خالق ومالک کو پہچاننے اور اپنے نامۂ اعمال پر غور کرنے کی زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے اور وہ حق کا اس گرمجوشی اور محبت سے استقبال کرتے ہیں جس طرح ایک ماں اپنے گمشدہ بچے کی مدتِ دراز تک جدائی برداشت کرنے کے بعد خیر مقدم کرتی ہے۔ ایک مومن ومسلم احکامِ الٰہی کو بار سمجھ کر نہیں سنتا بلکہ بڑی خوشدلی اور گرمجوشی کے ساتھ انہیں قبول کرتا ہے۔ اُن کی بجاآوری میں اسے بڑی راحت ملتی ہے اور وہ اسے اپنی غیر معمولی سعادت خیال کرتا ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

ایک مومن ومسلم جس طرح خدا پر ایمان لاکر اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اب وہ اپنی زندگی کی ساری خواہشات کو مرضیاتِ الٰہی کے تابع کردے گا اور اسی مقصد کے حصول کے لیے عمر بھر ہمت آزما رہے گا۔ یہی چیز اس کی زندگی کی غایتِ اولیٰ ہوگی۔ اسی طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی کا حق اسی طریق سے ادا کر رہا ہے جو اسے خدا کے آخری پیغمبر نے بتایا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ تمام انبیاء کرام علیہم السّلام کا ادب واحترام نہ کرے، ان کے سچّے پیغمبر ہونے پر یقین نہ رکھے اور ان سے تعلقِ خاطر کو ایمان کا ایک نہایت ضروری جزو نہ سمجھے۔ جو کوئی بھی اللہ کے فرستادوں سے کدر رکھتا ہے، ان کے خلاف اپنے سینے میں کوئی بغض وعناد پالتا ہے، جو اُن کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہنے کی جسارت کرتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے یکسر خارج ہے۔ لیکن ان حقائق کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ بمصداقِ "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" اور بتقاضائے ختمِ نبوّت ہم اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ بعض خصوصیات کے حامل ہونے کے لحاظ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک منفرد اور امتیازی شان رکھتے ہیں۔ حضور سیدالانبیاءؐ کی بعثت سے پہلے جتنے پیغمبر گزرے ہیں ان کی سیرتوں کا مقصد کسی ایک قوم کو خاص مدت تک رہنمائی دینا تھا۔ ایک زمانہ کے بعد بتدریج ان کی تعلیمات کے نقوش مدہم ہوتے گئے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ دنیا سے بالکل ناپید ہو گئے۔ اور ان کی حقیقت افسانوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

ان اولوالعزم انبیاء کی زندگیوں کے برعکس حضور ختم الرسُلؐ کی حیاتِ طیّبہ کا معمولی سے معمولی واقعہ آج بھی تاریخ کی پیشانی پر اسی طرح درخشندہ اور تابندہ ہے جس طرح کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا اور انسانیت کے قافلے جب کبھی حضورؐ کے نقشِ حیات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کی تازگی دیکھ کر فوراً پکار اٹھتے ہیں۔

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

اس حوادث آباد عالم کا تغیر وتبدل جس طرح اپنے سارے انقلابات کے باوجود خدا کی خدائی کو کسی طرح متاثر نہیں کر سکتا، وہ آج بھی اُسی طرح قائم ودائم ہے، جس طرح لاکھوں کروڑوں سال پہلے تھی، بالکل اسی طرح حضورؐ کی رسالت پر بھی گردشِ لیل ونہار کسی جہت سے

اثرانداز نہیں ہوسکتی۔ حضورؐ کی نبوت بھی زندۂ جاوید ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گی۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد نجات کی اب صرف ایک ہی صورت ممکن ہے کہ انسان اپنے دلوں کو مشکوٰۃِ نبوتؐ سے منور کریں۔ آنحضرتؐ کے بعد اگر کوئی شخص اُن کی نبوّت کے علاوہ کسی دوسری نبوت کا قائل ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے دل میں شمعِ ایمان فروزاں نہیں بلکہ دجل و فریب کی وہ چنگاری روشن ہے جو شیطان انسانوں کے خرمنِ ایمان کو خاکستر کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً جلاتا رہتا ہے۔ انسانیت کی فوز و فلاح اب صرف سرورِ کائنات کی غلامی میں ہے یہی ایک طوق ہے جس کو پہن کر وہ دنیا اور آخرت میں سرفراز ہوسکتا ہے۔ یہی اس کی سب سے قیمتی متاع ہے اور اسی پر ایک بندۂ مومن بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(بقرہ ۲ - ۵)

"جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ

"اے محمدؐ! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۔ (الاعراف ۱۵۸)

جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے۔ اور پیروی اختیار کرو اس کی۔ امید ہے کہ تم راہ راست پالوگے"۔

یہ دو آیات اس امر کی پورے طور پر صراحت کر رہی ہیں کہ فلاح اور ہدایت صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو خدا اور اس کی کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں۔ ان پر ایمان لائے بغیر نہ کوئی راہِ راست پر ہو سکتا ہے اور نہ فلاح پا سکتا ہے۔

اس ضمن میں پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معنی صرف یہی نہیں کہ حضورؐ کے رسولؐ ہونے کا محض زبان سے اقرار کر لیا جائے۔ حضورؐ کی رسالت پر ایمان کے بہت سے تقاضے ہیں۔ اس ایمان کی اصل روح یہ ہے کہ ہمیں حضورؐ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہو۔ ہمیں اس بات کا کامل یقین ہو کہ آپ صادق اور امین ہیں۔ آپ کے ہر قول اور ہر فعل کے اندر گہری حکمت اور دانائی ہے خواہ وہ حکمت اور دانائی ہماری سمجھ میں آ رہی ہو یا نہ آ رہی ہو۔ آپؐ نے جو راہ انسانیت کو دکھائی ہے صرف اُسی پر چل کر انسانیت کامیاب و کامران ہو سکتی ہے۔ آپؐ نے نوعِ بشری کو زندگی کے جو اصول دیئے ہیں وہ دائمی اور ابدی ہیں اور سخت نامراد ہے وہ انسان جو ان سے صرفِ نظر کر کے چلتا ہے۔ جب تک آدمی کے اندر حضورؐ کی ذات کے بارے میں اس قسم کا غیر متزلزل اعتماد نہ پیدا ہو، مجرد یہ کہہ دینے سے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دل کی گہرائیوں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا ہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اسکی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے خود اپنی محبت کا معیار اتباعِ رسول قرار دیا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آلِ عمران - ۳۱)

"کہہ دیجیے کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم کو محبوب رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔"

پھر اس کے ساتھ باری تعالیٰ نے اس امر کی بھی وضاحت فرما دی کہ رسول ؐ کی اطاعت خوشدلی اور محبت کے ساتھ ہو اور اس کے احکام کی بجا آوری میں انسان کو گونا گوں راحت ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

(النساء ۶۵)

"پس نہیں تمہارے رب کی قسم (اے محمد ؐ)، وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ ان تمام جھگڑوں میں جو ان کے درمیان واقع ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ (تمہارے فیصلے کو) سربسر تسلیم کر لیں۔"

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (النور ۵۱)

"اور مسلمانوں کا قول جب اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے یہ ہے کہ (خوشی خوشی) کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

ان آیات نے اس حقیقت کو صاف کر دیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں محض رجوع ایمان کے لیے کافی نہیں ہے۔ عقلی اور اعتقادی حیثیت سے بھی اطمینان رسولِ خدا ؐ کے فیصلوں پر ہونا چاہیئے۔ حضور ؐ کے ہر فیصلے کو پوری خوشدلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے۔

سورۃ الحجرات میں باری تعالیٰ بارگاہِ رسالت کے آداب بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ

"مسلمانو! تم اپنی آوازیں رسولِ خدا کی آواز سے اونچی نہ کرو۔"

حافظ ابنِ قیم نے اعلام الموقعین میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر حضور ؐ کی

آواز سے زیادہ اُونچی آواز نکالنا اعمال کے ضائع ہونے کا باعث بن سکتا ہے تو کیا حضورؐ کی آراء، حضورؐ کے فہم و فراست، حضورؐ کے ذوق پر اپنی رائے، اپنے فہم اور اپنے ذوق کو مقدم رکھنا اعمال کو ضائع نہیں کر سکتا۔ جو شخص ایمان کا دعویدار ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کا دم بھرتا ہے اس کے دعوے کی صداقت کا سارا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ وہ احکامِ الٰہی اور احکامِ رسولؐ کی سچے دل کے ساتھ پیروی کرے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب ۳۶)

"اور کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی امر کا حکم دیں تو پھر ان کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے زندگی کے جن معاملات کے متعلق اپنے احکام صادر فرما دیئے ہیں اُن میں اہلِ ایمان کوئی من مانی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ان سب معاملات میں انہیں احکامِ الٰہی اور ارشاداتِ رسولؐ کی پیروی کرنی چاہیئے اور یہی طرزِ عمل اختیار کرنے سے وہ مومن و مسلم کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ پر اعتماد و ایقان کی نوعیت وہ نہیں جو عام طور پر ان الفاظ سے سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا اعتماد ہے جس میں نہ کبھی تزلزل پیدا ہو سکتا ہے، نہ کبھی شک اور نفاق جنم لے سکتے ہیں اور نہ کبھی تردّد اور تذبذب وہاں اپنی راہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضورؐ پر جس طرح مکمل یقین اور اعتماد تھا اس کی تفصیل تو بڑی لمبی ہے۔ ہم یہاں صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

"ایک دفعہ کفارِ قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے فدائی حضرت ابوبکرؓ کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے "کیا اب بھی تم اپنے دوست کی محبت میں دامن گیر ہو۔ تمہارا دوست یہ کہنے لگا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رات کی تاریکیوں میں بیت المقدس لے گیا تھا۔ یہ بات جب حضرت ابوبکرؓ

نے سنی تو فرمایا۔ اگر انہوں نے یہ بات فرمائی ہے تو اس کے سچ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ فتنہ جُو لوگ حیران تھے کہ جو چیز ان کی نگاہ میں ناقابلِ یقین ہے وہ ابوبکرؓ کے لیے ہر لحاظ سے قابلِ تسلیم ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ سے کہنے لگے۔ "کیا تم یہ باور کر سکتے ہو کہ وہ رات ہی رات بیت المقدس گیا اور صبح ہونے سے پہلے واپس آ گیا؟"

حضرت صدیقؓ نے بڑے وثوق سے فرمایا۔ "اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس بات فرمائیں اور کہیں کہ میں نے آسمانوں کو صبح و شام میں طے کر لیا تو جب بھی میں آپ کو صادق ہی مانوں گا اور میرے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہ ہو گی"۔ اس کے بعد وہ حضورِ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی "اے اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے ان لوگوں سے بیان فرمایا کہ آج رات آپ بیت المقدس تشریف لے گئے تھے"... فرمایا "ہاں" عرض کی "اے اللہ کے نبی اس کے اوصاف مجھ سے بیان فرمایئے کیونکہ میں وہاں جا چکا ہوں"۔

حضور سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا:

فَرُفِعَ لِی حتی نظرت الیہ "وہ میرے سامنے اس طرح پیش کر دیا گیا کہ میں اسے دیکھنے لگا"۔

حضور جو کچھ اپنی زبان مبارک سے کہتے حضرت ابوبکر صدیقؓ صمیمِ قلب سے اس کو سنتے چلے جاتے اور کہتے جاتے۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے رسول ہیں"۔ یہاں تک کہ جب بیان ختم ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ سے فرمایا۔

"أنتَ یا ابابکر الصدیقُ" اے ابوبکرؓ تم صدیق ہو۔

رسالت پر اعتماد کی یہ وہ روشن مثال ہے جو ہر مسلمان کو اپنے پیشِ نظر رکھنی چاہیئے۔

صحابہؓ کرام کی محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

آپ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں

پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ رسولؐ کی محبت میں یکسر فنا ہو چکے تھے۔ حضرت جابرؓ کے والد جب غزوۂ احد کی شرکت کے لیے روانہ ہونے لگے تو بیٹے سے کہا کہ میں ضرور شہید ہوں گا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا مجھ کو زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے۔ تم میرا قرض ادا کرنا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک کرنا۔

حضرت اسید بن حضیر ایک شگفتہ مزاج صحابی تھے۔ ایک روز ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے کہ آپؐ نے ان کے پہلو میں ایک چھڑی سے کونچ دیا۔ انہوں نے اس کا انتقام لینا چاہا۔ آپ اس پر راضی ہو گئے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ آپؐ کے بدن پر قمیض ہے حالانکہ میں برہنہ تھا۔ آپؐ نے قمیض بھی اٹھا دی۔ قمیض کا اٹھانا تھا کہ وہ آپ سے لپٹ گئے پہلو چومے اور کہا یا رسول اللہ یہی مقصود تھا۔

حضورؐ عموماً فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے، صحابہ کرام کے سامنے آپ کی زندگی کا جب یہ منظر آجاتا تو فرطِ محبت سے آبدیدہ ہو جاتے۔ ایک بار حضرت عمرؓ کاشانۂ نبوت میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ آپؐ چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں جس پر کوئی بستر نہیں، جسم مبارک پر تہبند کے سوا کچھ نہیں، پہلو میں بدھیاں پڑ گئی ہیں۔ توشہ خانہ میں صرف مٹھی بھر جَو موجود تھے۔ آنکھوں سے بےساختہ آنسو نکل آئے۔ ارشاد ہوا کہ عمر کیوں روتے ہو؟ عرض کی۔ "کیوں نہ روؤں' آپ کی یہ حالت ہے اور قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے اڑا رہے ہیں۔" فرمایا "کیا تمہیں پسند نہیں کہ ہمارے لیے آخرت اور ان کے لیے دنیا ہو؟"

آپؐ کے وصال کے بعد صحابہ کو جب کبھی آپؐ کی یہ حالت یاد آتی ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلتے۔ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنے دوستوں کو گوشت روٹی کھلایا تو رو پڑے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور آپؐ نے پیٹ بھر کر جَو کی روٹی کبھی نہیں کھائی۔ حضرت عبداللہ بن عمر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ فرماتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

ایک دن حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا "جمعرات کا دن اور جمعرات کا دن کس قدر سخت تھا" اس کے بعد اس قدر روئے کہ زمین کی کنکریاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ حضرت سعید بن جبیرؓ نے پوچھا جمعرات کا دن کیا؟ بولے اسی دن آپؐ کے مرض الموت میں اشتداد ہوا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سلسلہ میں پھر ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ صرف ہمارے جذبات، احساسات ہی تک محدود نہ ہو بلکہ اسے ہماری زندگی کے سارے پہلوؤں پر محیط ہونا چاہیئے۔ ہماری حیات کا کوئی گوشہ، ہمارے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ اس کی فرمانروائی سے آزاد نہ ہو۔ اس محبت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہمارے افکار و نظریات، ہمارے اعمال و افعال، ہماری سیرت و کردار سب میں نہ صرف اس کے اثرات نمایاں ہوں بلکہ ان سب پر حضورؐ کی محبت کی گہری چھاپ ہو۔ وہ سب تعلیماتِ رسولؐ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اسلام میں وہ محبت بالکل بے معنی ہے جس کے پیچھے کامل اطاعت اور مکمل اتباع کا جذبہ کارفرما نہ ہو چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (محمد-۳۳)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو رائیگاں نہ کرو"۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (حشر رکوع ۱)

"جو تم کو رسولؐ نے دیا اس کو پکڑو اور جس سے تم کو روکا اس سے باز رہو"۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

"تم لوگوں کے لیے یعنی اس شخص کے لیے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہے، رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے"۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو اپنی زبان فیض ترجمان میں یوں بیان فرمایا ہے:

مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ اَحَبَّنِي مَنْ اَحَبَّنِي كَانَ مَعِي فِي الْجَنَّةِ - (ترمذی)

"جس نے میری سنّت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔"

عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال : كل امتی يدخلون الجنة الا من ابی ، قيل ومن يابی يارسول الله ، قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقد ابی -

(روالبخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے سب لوگ جنت میں جائیں گے مگر وہ جنت سے محروم رہیں گے جنہوں نے انکار کیا۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ انکار کون کریگا۔ آپؐ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا، جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔"

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں جو انس بنؓ مالک سے مروی ہے، فرمایا گیا:

قال رسول الله صلی الله عليه وسلم يا بُنی ان قدرت ان تصبح وتمسی وليس في قلبك غش لاحد فافعل ثم قال يا بُنی وذالك من سنتی من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی كان معی في الجنة (رواه الترمذی)

"حضورؐ نے فرمایا، اے فرزند اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ صبح و شام کسی وقت بھی تمہارے دل میں کسی کے لیے کھوٹ نہ رہے تو کر گزرو کیونکہ صاف سینہ رہنا یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ کو پسند کرتا ہے وہ ضرور میری محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔"

صحابہ کرام اتباعِ سنت کے اس قدر شدت سے پابند تھے کہ اس کی نظیر انسانوں کے کسی دوسرے گروہ میں نہیں ملتی۔ حضورؐ جو عمل کرتے یا جو کچھ ارشاد فرماتے، صحابہ ہمیشہ اس کی پیروی

کرتے۔ سیرت کی کتابوں میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک بار آپ مسجد سے نکل رہے تھے، دیکھا کہ راستے میں مرد اور عورت مل جل کر چل رہے ہیں۔ عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "پیچھے رہو، تم وسط راہ سے نہیں گزر سکتیں۔" اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ عورتیں اس قدر گلی کے کنارے چلتی تھیں کہ ان کے کپڑے دیواروں سے الجھ جاتے تھے۔

حضرت محمد بن اسلمؓ نہایت کبیر السن صحابی تھے۔ لیکن جب بازار سے پلٹ کر گھر آتے اور چادر اتارنے کے بعد یاد آتا کہ انہوں نے مسجدِ نبوی میں نماز نہیں پڑھی، تو کہتے کہ خدا کی قسم میں نے مسجدِ رسول اللہ میں نماز نہیں پڑھی، حالانکہ آپؐ نے ہم سے فرمایا تھا کہ جو شخص مدینہ میں آئے تو جب تک اس مسجد میں دو رکعت نماز نہ پڑھ لے گھر کو واپس نہ جائے۔ یہ کہہ کر چادر اٹھاتے اور مسجدِ نبوی میں دو رکعت نماز پڑھ کے واپس آتے۔

حضرت حذیفہؓ کے سامنے مداین کے ایک رئیس نے چاندی کے برتن میں پانی پیش کیا۔ انہوں نے اس کو اٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا کہ میں نے اس کو منع کیا تھا یہ باز نہیں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مخالفت فرمائی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نہ صرف احکام رسولؐ کی اتنی سختی سے اطاعت کرتے بلکہ سننِ عادیہ و اتفاقیہ کا اتباع بھی بڑے ہی اہتمام سے کیا جاتا۔ حضرت ابوالدرداءؓ جب کوئی بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے۔ ام الدرداءؓ نے کہا "اس عادت کو ترک کر دیجئے ورنہ لوگ آپ کو احمق بنائیں گے۔" بولے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ جب کوئی بات کہتے تھے، مسکرا دیتے تھے۔

ایک صحابی آپؐ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ آپ کی قمیص کا تکمہ کھلا ہوا ہے۔ آپؐ کی تقلید میں انہوں نے بھی عمر بھر قمیص کا تکمہ کھلا رکھا،

اور اس میں سردی اور گرمی کی کچھ پروا نہ کی۔

ان سب واقعات کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ محبت جب دل میں جاگزیں ہوتی ہے تو عملی زندگی پر اس کے اثرات بالضرور مرتب ہوتے ہیں۔ وہ محبت جس کی تائید عمل سے نہ ہوتی ہو کوئی زیادہ قابلِ اعتماد محبت نہیں۔ اگر محبت کا جذبہ اپنی حرارت سے محبت کرنے والوں کے افکار و اعمال کو ڈھال کر انہیں محبوب کے فکر و عمل کے مطابق بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی خامی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن قیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں:

ومن تامل ما فی السیر والاخبار الثابتة من شهادة کثیر من اهل الکتاب والمشرکین له صلی الله علیه وسلم بالرسالة وانه صادق فلم تدخلهم هذا الشهادة فی الاسلام علم ان الاسلام امر وراء ذلک وانه لیس هو المعرفة فقط ولا المعرفة والاقرار فقط بل المعرفة والاقرار والانقیاد والتزام طاعته ودینه ظاهرا وباطنا

"جو شخص کتب سیرت کا مطالعہ کرے گا اور ان میں بہت سے اہلِ کتاب اور مشرکین کی تصدیق کے واقعات پڑھے گا تو اس پر یہ بخوبی روشن ہو جائے گا کہ اسلام صرف آپؐ کی رسالت کی تصدیق کا نام نہیں، نہ وہ صرف معرفت ہے نہ صرف معرفت و اقرار کا نام ہے بلکہ جب تک ان کے علاوہ آپؐ کی ظاہری اور باطنی فرمانبرداری اور آپؐ کی پوری پوری اطاعت کا عہد بھی نہ کرے، اس وقت تک کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔"

حضرت شاہ ولی اللہ مسلمانوں کے انحطاط کا سب سے بڑا سبب سنتِ نبویؐ کے ترک کو قرار دیتے ہیں وہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تحریف کے سب راستوں سے متنبہ فرمایا اور اس بارے میں امت سے عہد و پیمان لیے، امت میں کاہلی اور سستی کا سب سے

بڑا سبب سنت سے صرفِ نظر ہے اور اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے۔ "مجھ سے پہلے خداوند تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جسے اپنی اُمت میں سے ایسے حواری اور اصحاب نہ ملے ہوں جو اس کی سنّت پر عمل کرتے اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد نااہل لوگ پیدا ہو جاتے ہیں، جو کچھ وہ کہتے ہیں کرتے نہیں اور جن باتوں کا حکم انہیں نہیں ہوتا وہ کرتے ہیں، پس جو ان سے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے وہ مومن ہے، جو ان سے زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے، اور اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَیں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور اس کے پاس میرا کوئی حکم آئے جو مَیں نے دیا ہو یا جس سے منع کیا ہو تو وہ کہنے لگے مَیں کچھ نہیں جانتا۔ جو کچھ ہم نے کتاب اللہ میں پایا، اس کا ہم نے اتباع کیا"۔ (یاد رکھو) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنّت پر عمل کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے"۔

ان صفحات میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضورؐ کے ساتھ ہمارا رشتہ کس قدر گہرا اور پائیدار ہے اور یہ دوسرے سارے رشتوں پر کس قدر حاوی ہے سخت ناداں ہیں وہ لوگ جو حضورؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کو صرف کاتب اور مکتوب الیہ کے تعلق سے تعبیر کرتے ہیں یا حضورؐ کو کسی معتمد ہرکارے کی حیثیت دیتے ہیں۔ حضورؐ کا کام صرف ابلاغِ حق ہی نہیں تھا بلکہ اس کا نفاذ اور قیام بھی ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ مقدس اس دین کی عملی تشریح ہے۔ حضورؐ ایک قاصد سے کہیں زیادہ بڑھ کر ایک معلّم، ایک مزکّی، ایک مرشد، ایک مبیّن، ایک مبشّر، ایک مُنذِر اور ایک سراجِ منیر ہیں۔ کلامِ الٰہی جس پیکرِ محسوس میں اپنی مکمل ترین صورت

میں جلوہ گر ہوا ہے وہ حضور سرورِ دو عالم کی ذاتِ گرامی ہی ہے۔

پھر حضورؐ کی یہ مختلف حیثیتیں صرف آپ کے زمانے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ قیامت تک اسی طرح رہیں گی۔ جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں اس وقت تک انسانیت کی سعادت اُنہی کی بلا چون وچرا اطاعت سے وابستہ ہے۔ جس چیز کو آپؐ نے حق کہہ دیا وہ وقت کے ہزار اختلاف کے باوجود ہمیشہ حق ہی رہے گی اور جسے آپ نے باطل قرار دیا اسے گردشِ ایام کبھی حق میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ حضور کی نبوّت کوئی ایسی نہیں جس کی راہ میں زمانہ کی دیواریں حائل ہوں۔ حضورؐ کی رسالت ابدی اور آفاقی ہے اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالکل ماورا۔ جنابِ رسالتمآبؐ آج بھی ایک مسلمان کے لیے اسی طرح ہادی اور مطاع ہیں جس طرح اپنی زندگی میں تھے۔ ایک انسان خواہ کسی دَور اور کسی ملک کا رہنے والا ہو اس وقت تک مسلمان نہیں بن سکتا، جب تک وہ حضورؐ کی چاکری اختیار نہ کرے اور پھر اس پر کسی قسم کا انقباض اور تنگی محسوس کرنے کے بجائے اسے اپنے لیے ہر لحاظ سے خیر و برکت نہ سمجھے۔

حضورؐ کی محبت ہی ایک مسلمان کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ایسا سرمایہ جس کو حاصل کر لینے کے بعد وہ ایمان ایسی عظیم نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ حدیث میں اسی امر کی وضاحت میں کہا گیا ہے:

من اطاع محمداً فقد اطاع الله و من عصیٰ محمداً فقد عصی الله و محمد فرق بین الناس ۔ (بخاری)

"جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی (اللہ کے ماننے اور نہ ماننے والے) لوگوں کے درمیان محمدؐ ہی نشانِ امتیاز ہیں"۔

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نومید و راہ مصطفےٰ گیر

اگر باور نداری آنچہ گفتم
ز دیں بگریز و مرگ کافرے میر

پانچواں باب

انسان کا مقصدِ حیات

انسان کے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال آتا ہے کہ آخر اس کی زندگی کی غایت الغایات کیا ہے؟ ایک باخدا سوسائٹی کے نزدیک اس کا جواب واضح ہے کہ جس ذات نے اسے اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے وہی اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی رضا جوئی کے لیے زندہ رہا جائے کیونکہ اگر اصل حاکم اور مالک کی خوشنودی کو نظر انداز کر کے کسی دوسری ذات کی رضا تلاش کی جائے تو زندگی کا فطری توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ اسی حقیقت کو سورۂ انعام کے آخری رکوع میں خود قرآن کے لانے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (الانعام ۶:۱۶۲)

"آپ اعلان کیجیے کہ میری نماز اور میری ہر قسم کی عبادت اور قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العلمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، مجھے یہی حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلے سرِ اطاعت خم کرنے والا ہوں"۔

باری تعالیٰ کا انسان سے یہ مطالبہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اسے انسان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ضرورت ہے اور اگر انسان نے یہ روش اختیار کرنے سے انکار کیا تو اس کے نظام میں اختلال پیدا ہو جائے گا۔ خالقِ کائنات نے انسان سے اگر یہ مطالبہ کیا ہے تو یہ بھی درحقیقت انسان کی بھلائی کے لیے ہے۔ اگر انسان اصل خالق کو پہچان کر اس کے سامنے سرِ نیاز خم نہ کرے، اور اس کی جگہ کچھ دوسرے خدا بنا لے تو اس کی اپنی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید نے سورۂ لقمان میں شرک کو جو ظلم کہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کی اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس خدا نے اسے پیدا کیا ہے، وہ اس کی رضا کو زندگی کی اساس بنانے کے بجائے کچھ دوسرے خداؤں سے تعلقِ خاطر پیدا کرلے۔ شرک صرف مٹی اور پتھر کے بتوں اور مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا نام نہیں بلکہ باری تعالیٰ کے حقوق میں کسی دوسرے کو شریک کرنے کا نام ہے۔ لوگوں نے عام طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر کوئی فرد یا قوم محض زبان سے خدا کو ایک مان لیتی ہے، تو وہ توحید کی علمبردار ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو اسلام اور غیر اسلامی قوتوں میں کبھی وہ شدید کشمکش برپا نہ ہوتی جو ہم تاریخ کے اوّلین دَور سے لے کر آج تک دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ خدا کا محض زبان سے اقرار کرنے یا انکار کرنے سے آخر زندگی میں وہ ہلچل کس طرح پیدا ہو سکتی تھی جو ہمیں انسانیت کی طویل تاریخ کے ہر گام پر نظر آتی ہے۔ توحید اور شرک کے مابین اس کشمکش اور اس آویزش کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ توحید ایک خدا کے صرف زبان کی حد تک اقرار کا نام نہیں بلکہ یہ حیاتِ انسانی میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیغام ہے۔ یہ زندگی کو اوّل تا آخر خدا پرستی کی بنیاد پر استوار کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان سب سے پہلے اس امر کا اعتراف کرے کہ تنہا خدا کی ذات ہی کائنات کی خالق و مالک اور فرمانروا ہے اور اسی کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ پوری کائنات انسان سمیت اس کی مطیع اور فرمانبردار ہو۔ نوعِ بشری کے ماسوا کائنات کی باقی چیزیں تو تکوینی طور پر اس کے تابع ہیں لیکن انسان کو چونکہ فہم و فراست کے ساتھ ساتھ ایک محدود پیمانے پر اختیار اور آزادی بھی

دی گئی ہے اس لیے زندگی کے اس آزاد گوشے کے لیے اس سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ از خود بغیر کسی خارجی دباؤ کے بندگیٔ رب کے تقاضے پورے کرے تاکہ اس کی اپنی زندگی میں توافق پیدا ہو، اور اس کا طرزِ عمل کائنات سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے۔

کائنات کے نہایت وسیع و عریض نظام پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہر حرکت متعین ہے اور اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے بڑی عمدگی کے ساتھ پیوست ہے۔ اس کے کسی شعبے میں کسی قسم کا کوئی اختلال نہیں۔ سورج، چاند، سیارے ایک بندھے ٹکے پروگرام کے تحت اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک لمحہ بھر کے لیے اپنے کام سے غافل نہیں ہوتا۔ اسی سے کائنات میں پوری ہم آہنگی موجود ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی اپنے کام میں ذرہ برابر تساہل کرے تو اس کائنات کا وجود ختم ہو جائے۔ ایک ہمہ گیر نظم ان سب کو اپنا پابند کیے ہوئے ہے اور انہیں ایک متعین راستے پر چلا رہا ہے۔

اسی نظم کا انسان بھی پابند ہے لیکن اس کے ایک گوشے میں اسے یہ آزادی ضرور دی گئی ہے کہ وہ اگر چاہے تو اس سے انحراف کرے لیکن اس انحراف کا بھی اسے شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس سے اُس کی زندگی کا پُورا توازن بگڑ جاتا ہے جو بالآخر خوفناک تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ مثلاً آپ یہ دیکھیے کہ جو فرد یا قوم کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی زندگی کو اس کے منشا اور مرضی کے مطابق ڈھالنے سے گریز کرتی ہے وہ لازمی طور پر دو خطرناک نتائج سے دوچار ہوتی ہے۔ یا تو اس کے ہاں شدید خلفشار رُونما ہوتا ہے، جو بالآخر اسے تباہ کر دیتا ہے یا پھر دوسری شدید نوعیت کی جکڑبندیاں اسے کسی نظم کا پابند بناتی ہیں اور اسے اس مقام پر لے آتی ہیں جس پر بھپرے ہوئے اور خونخوار جانور زنجیروں میں جکڑ کر رکھے جاتے ہیں۔ یہ دو خطرناک نتائج دو مختلف نظام ہائے حیات سرمایہ داری اور اشتراکیت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

سرمایہ داری جس کی اساس انفرادیت پسندی ہے، کا یہ پہلو بہر حال صحیح ہے، کہ کسی معاشرے میں مرکزی مقام فرد ہی کو حاصل ہوتا ہے، فرد وہ بنیادی اکائی ہے جس پر معاشرے

کی سربفلک عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ہدایت و رہنمائی کے مقدس کام کا آغاز بھی فرد ہی سے ہوتا ہے اور اجتماعی بگاڑ کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔ اس بنا پر تعمیر و ترقی کا کوئی کام فرد کو بحیثیتِ فرد نظر انداز کر کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ معاشرتی بگاڑ اور اس کے تباہ کن نتائج کا اندازہ افراد ہی سے لگایا جاتا ہے۔ پھر اگر اس کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب نے بھی فرد ہی کو ایک بنیادی اکائی تصور کر کے اس کی اصلاح کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق دیا ہے اور اسے بحیثیت فرد ہی اپنے ہر قول اور فعل کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

جب فرد کو اس دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے تو لامحالہ اجتماعی تگ و دَو کا منتہائے مقصود فرد کی بھلائی ہی ہونا چاہیئے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہے اور اس بنا پر ہر فرد اپنا یہ جائز حق رکھتا ہے کہ وہ معاشرے سے اپنی آزادی، خود مختاری اور اپنے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کا تقاضا کرے۔ مگر دیکھیے کہ فرد کا جو حق اپنے فطری حدود کے اندر رہتے ہوئے بالکل صحیح اور مبنی بر انصاف ہے، وہی جب جائز حدود سے تجاوز کرتا ہے تو معاشرے کے لیے کتنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ کسی فرد کا حق اسی صورت میں قابلِ احترام ہے جب اس سے دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوتے ہوں۔ لیکن جب ایک فرد یا چند افراد چالاکی اور عیاری سے، یا اپنی قوت و طاقت سے اپنے حقوق کے دائرے کو اتنا وسیع کر دیں کہ ان سے دوسروں کے حقوق پر دست درازی ہوتی ہو، اور معاشرہ بحیثیتِ مجموعی نقصان اٹھاتا ہو، تو معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام اور حفظ و بقا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔

فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کا مسئلہ صنعتی انقلاب سے پہلے کچھ بہت زیادہ پیچیدہ نہ تھا۔ لیکن اس ہمہ گیر انقلاب کے بعد جب وسائلِ رزق پر ایک مختصر سے طبقے کا قبضہ ہونے لگا اور اس قبضے کی وجہ سے قوت و اقتدار کی باگیں بھی خود بخود اسی کے ہاتھ میں آگئیں تو اس وقت اس سوال نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی۔

انفرادیت پسندی کے علمبرداروں نے بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ وہ اپنے ہر انفرادی

اور اجتماعی فعل میں آزاد اور خودمختار ہیں اور معاشرے سے جس طرح فائدہ اٹھانا چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ ریاست یا معاشرے کو اس بات کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ان کے معاملات میں دخیل ہو۔ معاشرہ اور ریاست افراد کی خداداد صلاحیتوں کو کام کا موقع دینے کے لیے ہیں، ان کا کام افراد کی سرگرمیوں پر پابندی لگانا نہیں بلکہ اس امر کا التزام کرنا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی سرگرمیوں میں دخیل نہ ہونے پائے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ لوگوں کی تگ و دَو کو ایک خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہے۔ البتہ جب کوئی اس میں مداخلت کرے تو اسے پوری قوت سے دبا دے۔ چنانچہ اس انفرادیت پسندی کے نظام میں ریاست کے فرائض صرف دو کاموں پر مشتمل تھے: بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ اور داخلی انتشار سے حفاظت۔ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں جو نظامِ ریاست، جو نظامِ معیشت اور جو نظامِ معاشرت قائم ہوا وہ سراسر چند چالاک اور مالی اعتبار سے مضبوط افراد کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ افراد جس طرح چاہتے معاشرے کے کمزور اور بے بس لوگوں کو لوٹتے اور حکومت کی سنگینیں ان کی حفاظت کرتیں۔ عدالتیں انکے مفادات کی پاسبان اور نگران ہوتیں، ملکی قوانین اُن کی اِن ظالمانہ کارروائیوں کی تائید کرتے اس طرح ان لوگوں نے نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر عوام میں جیسے چاہا دستِ ظلم دراز کیا اور ان کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ اس ظلم و استبداد سے گھبرا کر اگر عوام میں کوئی تحریک پیدا ہوتی تو حکومت اسے سختی سے دبا دیتی۔ اگر وہ بے چارے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ جن ایوانوں کو وہ غریبوں اور بے کسوں کی آخری پناہ گاہ خیال کر رہے ہیں وہ صرف امراء کے حقوق کے محافظ ہیں۔ غرض زندگی ان کمزوروں کے لیے پوری طرح عذاب بن کر رہ گئی تھی۔

فلسفۂ اجتماعیت

ہر وہ عمل جو اپنے فطری حدود سے متجاوز ہو، جس میں اعتدال قائم نہ رکھا گیا ہو، اور جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو، خود اپنا ایک ردِّ عمل پیدا کرتا ہے اس ردِّ عمل

میں توازن نہیں ہوتا۔ غیر متوازن طرزِ عمل، غیر متوازن ردِ عمل ہی پر منتج ہوتا ہے۔ یہی معاملہ انفرادیت پسندی کی غیر متوازن تحریک کے ساتھ بھی پیش آیا۔ پسے ہوئے عوام کے اندر خفتہ روح بیدار ہوئی اور انہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے دولت وہ کماتے ہیں اور ایک مختصر سا عیار طبقہ محض وسائلِ رزق پر قابض ہونے کی وجہ سے ان کی کمائی کا بیشتر حصہ ہتھیا لیتا ہے۔ اس احساس نے جو بالکل حقیقت پر مبنی تھا، آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کی اور سوچنے سمجھنے والے دماغ اس نتیجہ پر پہنچے کہ معاشرے میں جبر و استبداد کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ذرائع پیداوار پر افراد قابض ہیں۔ اگر ان ذرائع کو معاشرے کی تحویل میں دے دیا جائے تو پھر افراد غریبوں اور بے کسوں پر دستِ ظلم دراز نہ کر سکیں گے۔ اس نظریہ کو صحیح اور برحق ثابت کرنا اور اسے عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے ایک فکری انقلاب کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ فکر و نظر کے اس عظیم تغیر کے لیے باقاعدہ ایک نیا فلسفہ گھڑا گیا۔

اس فلسفہ کی ابتدا بھی انسانی فطرت کے غلط تجزیے سے ہوئی۔ انسان کو قابلِ اعتماد اور اجتماعی ذمہ داریوں کا امین سمجھنے کے بجائے اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ فطری طور پر ناقابلِ اعتماد ہے۔ وہ حرص و آز کا بندہ ہے۔ اسے جب کوئی آزادی دی جائے گی تو لازمی طور پر وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ اسے جب بھی قوت حاصل ہو گی، وہ اسے ابنائے جنس کی بربادی کے لیے استعمال کرے گا۔ اسے اپنے معاملات کا خود مختار بنا کر اس سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع رکھنا محض خام خیالی ہے۔ طمع، حرص، برائی، سفاکی اور زیر دست آزاری اس کی فطرت میں داخل ہیں۔ انسانی فطرت کے بارے میں پیدائشی گناہ گار ہونے کا تصور مغربی ذہنوں میں ان کے مذہبی معتقدات کی بنا پر چونکہ پہلے ہی سے رچا بسا تھا اس لیے انہوں نے انسان کے بارے میں اس نئے نظریہ کو سراسر حق سمجھ کر بڑے والہانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت کے بارے میں اس نظریہ کو

کائنات کی سب سے بڑی سچائی سمجھ کر فوراً قبول کر لیا اور یہ سمجھنے لگے کہ اسے پا لینے کے بعد اب کائنات کی ساری گتھیاں خود بخود سلجھ جائیں گی۔

جب انسان فطری طور پر ظالم، سفاک، حرص کا غلام اور ناقابلِ اعتماد ٹھہرا تو اس کے شر سے محفوظ رہنے کی یہی صورت ممکن تھی کہ اسے اجتماعی جکڑ بندیوں میں پوری طرح جکڑ کر رکھ دیا جائے تا کہ اس کی بدفطرت من مانی کارروائیاں کرنے سے باز رہے۔ اس کے جواز کے لیے بھی فرد اور معاشرے کے باہمی تعلقات کا پھر سے جائزہ لیا گیا اور یہ طے پایا کہ معاشرے میں ایک فرد کو جو بنیادی اکائی تصور کیا گیا ہے یہی درحقیقت فساد کا منبع ہے جس سے شر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فرد اور معاشرے میں مرکزی اہمیت معاشرے کو حاصل ہے اور فرد اس کی خدمت اور چاکری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ معاشرہ جس چیز کو فلاح کہہ دے وہی درحقیقت بھلائی ہے اور جسے وہ برائی قرار دے وہی فی الحقیقت برائی ہے۔ اس نئے نظریہ کے مطابق معیارِ حق و باطل افراد کی بہبود نہیں بلکہ معاشرے کی فلاح ہے۔

معاشرے کا جمہوری تصوّر تو یہ ہے کہ معاشرہ افراد سے تعمیر ہوتا ہے۔ افراد کی بھلائی بالآخر معاشرے کی بھلائی پر منعکس ہوتی ہے لیکن اشتراکی نظریہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں معاشرہ خود ایک قائم بالذّات حقیقت ہے اور افراد محض اس کے کل پُرزے ہیں۔ ان دونوں نظریات کے درمیان جو ایک لطیف سا فرق ہے اسے ہم ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جمہوری نظریہ کے مطابق معاشرہ ایک گلدستہ ہے جو مختلف پھول چُن کر ترتیب دیا جاتا ہے اس میں بنیادی اہمیت پھولوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس اشتراکی نظریہ کی رُو سے معاشرہ ایک جاندار درخت کی حیثیت رکھتا ہے اور افراد محض اس کے پتّے ہیں۔ پہلے نظریہ کے مطابق جس طرح گلدستہ اپنے حسنِ ترتیب کے لیے رنگا رنگ پھولوں کا محتاج ہے بالکل اسی طرح معاشرہ بھی اجتماعی فوز و فلاح کے لیے افراد کا دست نگر ہے۔ افراد وہ بنیادی اکائیاں ہیں جن سے معاشرہ ترتیب پاتا ہے۔ مگر اشتراکی نظریہ کے مطابق افراد کی اپنی کوئی الگ اور مستقل حیثیت

نہیں۔ وہ اپنی بقا اور فلاح کے لیے سراسر معاشرے کے محتاج ہیں۔ اگر وہ پتوں کی طرح شجر سے وابستہ رہیں اور معاشرہ جس قسم کی غذا انہیں فراہم کرے اسے بلا چون وچرا ہضم کرتے رہیں تو انہیں بہار کی کوئی امید ہو سکتی ہے ورنہ ان کے لیے خزاں ہی خزاں ہے۔

نظامہائے حیات کے بنیادی اختلافات

طرزِ فکر کا یہ اختلاف کوئی معمولی نہیں بلکہ ایسے بنیادی تصورات کا اختلاف ہے جس نے دو مختلف نظامہائے حیات کو جنم دیا ہے۔ جس معاشرے میں فرد کو بنیادی اہمیت حاصل ہو وہاں جمہوری روایات پرورش پاتی ہیں اور اس کے مقابلے میں جہاں معاشرے کو بنیاد قرار دے کر افراد کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں وہاں نہایت ظالمانہ قسم کی آمریت مسلط ہوتی ہے۔ جب آپ یہ فرض کرلیں کہ موج کی جو کچھ افادیت ہے وہ صرف دریا میں شامل ہونے کی وجہ سے ہے اور بیرونِ دریا وہ قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتی تو موج کے لیے زندگی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تند و تیز دھارے میں گم کر کے اپنے وجود کو یکسر فنا کر دے۔ اور دھارا جس رُخ پر اُسے بہا کر لے جائے اُسی سمت بڑی خوش دلی کے ساتھ بہتی چلی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں معاشرے نے ایک سیلِ بے پناہ کی صورت میں انفرادیت کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

پھر اس معاملہ کا ایک اور قابلِ غور پہلو مذہبی عقائد اور نظامِ اخلاق ہے۔ جب فرد خود ایک حقیقت ہے اور معاشرہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے معرضِ وجود میں آتا ہے تو وہ لازمی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے نظامِ اخلاق کا پابند بنانے کی خواہش کرے گا، جس میں مذہبی تقدیس ہو اور جو اُس کی مادی فلاح و بہبود کا ذریعہ بننے کے ساتھ ساتھ اس کی روح کو بھی سکون مہیا کر سکے۔ اس طرح وہ اپنا تعلقِ عبودیت اس ذاتِ بے ہمتا سے جوڑے گا جسے وہ کائنات کی علتِ اولیٰ سمجھتا ہے۔

خدا، مذہب اور رُوح کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رُوح کا وجود اسی صورت میں

تسلیم کیا جا سکتا ہے جب فرد اپنی ایک الگ ذات رکھتا ہو اور یہ ذات اپنے خالق و مالک سے اسی وقت رشتۂ عبودیت استوار کر سکتی ہے جب وہ ضرورت پیش آنے پر خدا کے سوا ساری کائنات سے بے نیاز ہو سکتی ہو۔ اگر یہ شخص غلطی سے فرض کرلے کہ اس کا وجود صرف معاشرے کا رہینِ منت ہے تو فطری طور پر معاشرے کو وہی ارفع و اعلیٰ مقام عطا کرے گا جو ایک خدا پرست خالقِ کائنات کو دیتا ہے۔ اس لیے وہ ہر اس نظام سے بغاوت کرے گا جو معاشرے پر فوقیت رکھنے کا دعویدار ہو۔ اشتراکیت کے نزدیک معاشرے سے بڑا کوئی خدا نہیں اور اس کی بندگی سے بڑھ کر کوئی اور بندگی نہیں۔

اسلام کی راہِ اعتدال

اسلام حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت پسندی اور حد سے بڑھی ہوئی اجتماعیت کے مابین راہِ اعتدال ہے۔ یہ نہ تو فرد کو اتنی کھلی چھٹی دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اجتماعی مصالح کو اپنی حرص کی بھینٹ چڑھاتا رہے اور نہ معاشرے کو یہ حق دیتا ہے کہ افراد کو بے جان کل پرزے سمجھ کر جس طرح چاہے اُن سے کام لیتا رہے۔

خدا نے انسان کو بحیثیتِ فرد پیدا کیا ہے، اس لیے اسلام اس کی انفرادیت کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے لیکن چونکہ انسانیت کی صحیح نشو ونما معاشرے کے ذریعہ ہی ممکن ہے، اس لیے اسلام نے فرد اور معاشرے دونوں کے حقوق و فرائض کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا ہے تاکہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بنیں۔ معاشرے کا فرض یہ ہے کہ وہ فرد کی آزادی کا احترام کرے، اور اسے تمام ایسے مواقع مہیا کرے جن کے ذریعہ اس کی خداداد صلاحیتیں پوری طرح پروان چڑھیں اور پھر تعمیر و ترقی کے اس راستہ پر صرف ہوں جو اللہ تعالیٰ نے متعین فرمایا ہے اور افراد کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی فلاح میں مزاحم ہونے کے بجائے اس کے لیے معاون و مددگار رہوں۔ اس طرح اسلام میں نہ تو فرد کو اجتماعی مفاد کے خلاف کام کرنے کی کھلی چھٹی دی

جاتی ہے اور نہ معاشرہ افراد سے اپنی غیر مشروط اطاعت کا تقاضا کر کے انہیں اپنی بندگی میں گرفتار کرتا ہے۔ اسلام نے فرد اور معاشرے دونوں کو اپنے احکام کا پابند بنایا ہے اور ان میں سے کسی کو بھی من مانی کارروائیاں کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑا۔

چھٹا باب

انسان اور رائج الوقت تہذیبیں

جس طرح کوئی جہاز بے لنگر ہو کر سمندروں میں آوارہ تیرتا پھرتا ہے، یا کوئی شتر بے مہار جس طرف چاہتا ہے رُخ کر لیتا ہے بالکل اسی طرح قومیں مقصد کی محبت سے محروم ہو کر گمراہیوں کے مختلف فتنوں کی نذر ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی ایک گمراہی کا سیلاب آیا تو وہ انہیں تنکوں کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اور کبھی کسی دوسری گمراہی کا غلغلہ بلند ہوا تو انہوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ جس طرح بے مقصد انسان در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے بالکل اسی طرح بے مقصد قومیں بدنصیبی کے دھکے کھاتی رہتی ہیں۔ آپ ذرا اپنی چشمِ تصور کے سامنے اس بدنصیب قافلے کو لایئے جس کی آنکھوں سے اس کا نصب العین اوجھل ہو چکا ہو اور وہ اس بے بسی کے عالم میں ہر راہرو کے ساتھ چند قدم چلنے پر مجبور ہو۔ پھر ہر ایک کے ساتھ کچھ دُور چلنے کے بعد وہ مایوس ہو کر اس بنا پر اُس سے الگ ہونے کے لیے بیتاب ہو کہ یہ رہبر جس منزل کی طرف لیے جارہا ہے یہ اس کی منزلِ مقصود نہیں ہے۔ ایسا حرماں نصیب قافلہ اپنے اوقات، اپنی قوتوں اور اپنے مال کا جس طرح زیاں کر رہا ہو گا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

مسلمانوں کی تغیّر پذیری

ہم اسے مسلم قوم کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی بدنصیبی سمجھتے ہیں کہ انسانوں کا وہ گروہ

جسے انبیاء علیہم السّلام کا وارث بنا کر پوری نوعِ بشری کی ہدایت کا فرض سونپا گیا تھا وہ آج خود اپنی منزل کھو دینے کی وجہ سے آوارہ و سرگرداں ہے اور انسانیت کے بھولے بھٹکے قافلوں کو راستہ دکھانے کے بجائے خود ان کے ساتھ گمراہی اور ضلالت کی مختلف وادیوں میں بھٹک رہا ہے۔ کبھی خدا ناشناس سائنس دانوں اور نیچریوں کے قافلے اس کی نظروں کو مفتوح کر لیتے ہیں، کبھی یہ آمریت کے کاروانوں کے ساتھ ہم عناں ہو کر آگے بڑھنے لگتا ہے اور کبھی اشتراکیت کے جرس اسے مسحور کر کے اشتمالیت کی راہ پر ڈال دیتے ہیں:

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے'

پھر اس مسلم قافلے کی مزید بدنصیبی یہ ہے کہ اپنے نصب العین کو نظر انداز کر کے یہ ایسے قافلوں کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھتا ہے جن کی منزلِ مقصود کسی صورت میں بھی اسلام نہیں ہوتی، لیکن خود اپنے آپ کو اور پوری نوعِ انسانی کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ان کی پیروی میں ضلالت کی راہ پر نہیں جا رہا ہے بلکہ حق و صداقت ہی کے راستے پر گامزن ہے۔ اس کے اس کھلے ہوئے تضاد یا ابلہ فریبی پر جب کوئی گرفت کرتا ہے تو وہ بڑی تمکنت کے ساتھ کہتا ہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ اسلام کی حقیقی منزلِ مقصود کیا ہے۔ جس سمت یہ سارے کارواں رواں دواں ہیں وہی درحقیقت اسلام ہے۔ پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ان دونوں کے درمیان تو بُعد المشرقین ہے تو وہ برافروختہ ہو کر اور جھلّا کر کہتا ہے کہ یہ سب کم ظرف ملّاؤں کی تنگ نظری اور تعصّب کا نتیجہ ہے کہ وہ ملّی قافلے کی حرکت و حرارت کی صحیح طور پر قدر نہیں پہچانتے۔ اسلام بھی تو انہیں اسی منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے جس طرف یہ قافلے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر اسلام کی ایسی عجیب و غریب تاویلات شروع ہو جاتی ہیں جن سے ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں کو رشد و ہدایت کی قندیلیں ثابت کیا جاتا ہے۔

آپ اگر گزشتہ ایک صدی کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس دور

میں اسلام سے زیادہ سیال، اس سے زیادہ تغیر پذیر، اور اس سے زیادہ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اڑ جانے والا کوئی نظریۂ حیات نہیں رہا۔ جب یورپ میں سرمایہ پرستی کا جنون بڑھا تو مسلمان ممالک میں سود کی حرمت کو حلت سے بدلنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ جب مغربی نظامِ فکر نے زور پکڑا تو دینی تعلیم فرسودہ قرار دی گئی، مغربی تعلیم کے چرچے ہونے شروع ہوئے اور اس سے جو نسل فیضیاب ہو کر میدانِ عمل میں نکلی اس نے خدا، وحی، الہام، رسالت، آخرت، غرض اسلام کے سارے اساسی تصورات میں ایسے تغیرات لانے کی کوشش کی کہ وہ مغربی افکار سے یکسر ہم آہنگ ہو جائیں۔ اس کے بعد یورپ میں قوم پرستی اور سیکولرزم کا دور دورہ ہوا تو مسلم قوم کے نادان دوستوں نے عالمگیر اُمت کے ٹکڑے کر کے قوم پرستانہ لادینی تحریکوں اور ریاستوں کو اپنا مسلک و نصب العین بنا لیا اور علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ ہماری اوّلین وفاداری اپنے وطن اور اپنی قوم سے ہے، مذہب کا تعلق بعد کی چیز ہے۔ پھر جب چند سال پیشتر چند قوموں کے سروں میں آمریت کا سودا سمایا اور انہوں نے پاگل پن کے عالم میں پوری دنیا کے امن کو برباد کیا تو مسلمانوں کے بہت سے طبقوں نے اُمت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسلام تو درحقیقت ڈکٹیٹر شپ ہی کا دوسرا نام ہے[1]۔ اب سرمایہ داری

---

[1] اس دور میں مسلمان ان آمرانہ تحریکات سے کس قدر مرعوب تھے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کے لیے میں بطورِ مثال ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔ میں ان دنوں ایک ہائی اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ ہمارے دینیات کے معلّم جو بڑے نیک اور پاکباز تھے، وہ ہر روز جماعت میں ہمیں یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے کہ ہٹلر اور مسولینی جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلام کے عین مطابق ہے اور اُمت کی بگڑی اگر کسی طرح بن سکتی ہے تو وہ اس آمرانہ نظام کو اپنا کر ہی بن سکتی ہے۔ انہوں نے ازراہِ عنایت مجھے ہٹلر کی مشہور تصنیف "میری جدوجہد" پڑھنے کے لیے بھی دی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے حواشی پر جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات درج کر رکھی تھیں۔ (ع ح ص)

اسلامی سوشلزم کا موضوع دَورِ حاضر کے متجدّ دین کا بڑا دل پسند مشغلہ ہے سرمایہ دارانہ نظام نے بندۂ مزدور کے خصوصاً مشرقی ممالک کے بندۂ مزدور کے اوقات سخت تلخ کر دیئے ہیں اور وہ معاشی اعتبار سے بڑے بدحال ہیں اس لیے اسلام میں رخنے ڈالنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ انہیں یہ بات سمجھائی جائے کہ جس دین کی وجہ سے تم اشتراکیت سے بدظن ہو اس دین کے معاشی تقاضے تو اشتراکیت ہی پورے کرتی ہے۔ سرمایہ داری کے حامی اور رجعت پسند علماء نے اس دینِ مارکسی کو تمہارے لیے خواہ مخواہ ہوّا بنا دیا ہے، ورنہ یہ دین اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام ہی ہے۔ البتہ تمہیں اس امر کا یقین دلانے کے لیے کہ ہم اشتراکیت کے ساتھ ساتھ اسلام کا دامن بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہم تمہارے لیے اسلامی اشتراکیت کا نظام تجویز کرتے ہیں۔

آجکل "اسلامی اشتراکیت" کا چونکہ بڑا چرچا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اسلام اور اشتراکیت کے مابین جو اساسی اور بنیادی فرق ہے اسے واضح کر دیا جائے اور جو لوگ اس کے علمبردار ہیں ان کے اصل عزائم کی نشاندہی کی جائے تاکہ عوام کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دُور ہو سکیں۔

الہامی مذاہب کی تہذیبی اساس

تمام الہامی مذاہب کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سب کے اندر چار چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلے کسی مافوق الطبیعی ہستی پر ایمان جو اس کائنات کی خالق اور منتظم بھی ہے، اور دوسرے اس کی طرف سے انسان کے رشد و ہدایت کے لیے انتظام پر یقین۔ تیسرے اپنے اچھے بُرے اعمال کی جزا و سزا کا احساس اور چوتھے انسان کے ایک ذی روح مخلوق ہونے کا عقیدہ۔

پہلے تین عقائد خالق و مالک کی ہستی سے تعلق رکھتے ہیں اور آخری عقیدہ اس کائنات میں انسان کا مرتبہ و مقام متشخص کرتا ہے۔ آپ اس عقیدے کا جتنا گہرا تجزیہ کریں گے

اسی نسبت سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہوگی کہ انسان کے ایک ذی روح اور صاحبِ شعور ہستی ہونے ہی کی بنا پر، اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے، اس کی ہدایت کو سمجھ کر اس کی پیروی کرے، پھر اس علیم و خبیر ہستی کی رضا جوئی کے لیے ایک خاص طرزِ زندگی اختیار کرے اور اپنے اس عمل کے لیے اس سے آخرت میں جزا کی امید رکھے۔

باری تعالیٰ کی معرفت، اس کی دی ہوئی ہدایت کی پیروی، پھر اس کی خوشنودی کی خاطر اپنے آپ پر بعض پابندیاں عائد کرنے اور بعض مصائب برداشت کرنے کا کام اور اپنے کیے کی جزا اور سزا پر یقین اس بات کی واضح شہادت ہے کہ انسان کو اگرچہ پیدا تو ایک معاشرے ہی میں کیا جاتا ہے مگر اسے ایک الگ روح اور شخصیت دے کر دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ وہ ابنائے نوع کے ساتھ مل کر جتنے کام بھی کرتا ہے ان میں اکثر اگرچہ اجتماعی نوعیت کے ہوتے ہیں مگر اسے آخرت میں ایک فرد کی حیثیت ہی سے اپنے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس کے اعمال الگ تولے جائیں گے اور اسی کے مطابق آخرت میں اس کے مقام کا فیصلہ ہوگا۔ قرآن مجید میں

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى

ایک بڑا معنی خیز ارشاد ہے جو انسان کی انفرادیت اور اس کے احترام کی صراحت کرتا ہے۔ انسان کی انفرادیت، اس کی دوسروں سے الگ شخصیت اور اس کا اپنی الگ روح کے ساتھ زندگی گزارنا وہ اساس ہے جس پر مذہبی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

مادی تہذیب کی اساس

چنانچہ دیکھیے جن قوموں نے انسان کے بارے میں اس تصور کو نظر انداز کر کے انسان کو محض درخت کا ایک پتہ سمجھا انہیں لامحالہ آخرت اور اس کی جزا و سزا سے انکار کرنا پڑا۔ انسان جب یہ سمجھ لے کہ اس کی اپنی الگ کوئی روحانی حیثیت نہیں بلکہ وہ اجتماعیت کی مشین کا محض ایک پُرزہ ہے اور اس کا وجود اجتماعی مفادات کی تکمیل ہی کے لیے ہے تو پھر اس کو خدا خوفی اور آخرت کی جواب دہی سے کہیں زیادہ اس معاشرے کے مفادات کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے، جس کا وہ

فرد ہے اور وہ صرف انہی کاموں میں دلچسپی لینے لگتا ہے جو اجتماعیت کو تقویت پہنچا سکیں۔ ایسے لوگوں کے ہاں نیکی اور بدی کے تصورات بدل جاتے ہیں۔ نیکی پھر ان کے نزدیک وہ عمل نہیں رہتی جسے اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ قرار دیا ہو، بلکہ وہ فعل بن جاتی ہے جو اجتماعی نقطۂ نظر سے سُود مند ہو۔ اگر معاشرہ نظم وضبط سکھانے کے لیے نماز کو مفید سمجھے تو نماز کی ادائیگی محمود فعل ہے، لیکن اگر اس کا فیصلہ یہ ہو کہ ان اوقات کو صنعتی اور زرعی ترقی کے لیے صرف کرنا زیادہ مفید ہے تو پھر نماز ایک گناہ اور وقت کا زیاں ہے۔ اور صنعتی ترقی کے لیے کوشش عین عبادت اور نیکی ہے۔ معاملہ اسی حد پر نہیں رکتا بلکہ جب انسانوں کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ اصل چیز اجتماعیت ہے، اجتماعی مفادات کا حصول ہی اصل مقصود و مطلوب ہے اجتماعی کوششیں ہی اصل عبادت ہیں اور ان کے نتیجے میں جو کچھ ملے وہی آخرت کا ثمرہ ہے تو پھر حیات بعد الموت کا عقیدہ بھی بے معنی ہو جاتا ہے جسے اگر کچھ مدت تک "تکلفاً" ساتھ لے کر چلا بھی جائے تو زندگی پر اس کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ دنیا کی جتنی قوموں نے انسان کی روح اور اس کی انفرادیت سے انکار کیا اور اسے اجتماعیت کے سمندر کا محض ایک قطرہ خیال کیا جس کا کام ہی موجوں کے ساتھ بہنا ہے، ان قوموں نے آخرت کے تصورِ جزا و سزا کا بھی لازماً ابطال کیا ہے۔

دُور نہ جایئے، اپنے ہاں ہی دیکھ لیجیے کہ جو لوگ اجتماعی مفادات کو کسی عمل کے لیے اخلاق کی سب سے بڑی بنیاد سمجھتے ہیں وہ آخرت کے اس تصوّر کے مُنکر ہیں جو ہمیں اسلام نے دیا ہے۔ ان کے نزدیک جنت و دوزخ اسی دنیا میں ہیں۔ قوم کی اجتماعی جدوجہد جب بار آور ہو کر قوم کے لیے خوشحالی پیدا کرتی ہے تو وہ جنت ہے اور جب وہ ہاتھ توڑ کر بیٹھ جاتی ہے اور اسے بدحالی سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ درحقیقت خود بھی دوزخ کی آگ میں جلتی ہے اور آنے والی نسلوں کو بھی اس میں جھونک دیتی ہے۔

آخرت اور جنت و دوزخ کا یہ تصور ممکن ہے ایک محدود سے مغرب زدہ طبقے کو متاثر

کرے لیکن ایک مسلمان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تصور اُس اساسی تصور کے خلاف ہے جو اسے عقیدۂ آخرت کی صورت میں اسلام نے دیا ہے۔ دینِ حق نے اس کے ذہن میں جو خیال بٹھایا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اعمال و افعال کو مادی پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔ باری تعالیٰ کی نظر میں کسی فرد کے اعمال کی اصل اہمیت ان کے مادی ثمرات نہیں بلکہ ان کے اخلاقی اور روحانی پہلو ہیں۔ آخرت کے دن ان کی قدر و قیمت کا فیصلہ اجتماعی منصوبوں کی تکمیل کے تحت نہیں ہوگا بلکہ ہر شخص کی کارگزاریوں کا فیصلہ اس کے ایک ایک فعل کو، اس کی نیت اور اس کے اخلاقی محرکات کے لحاظ سے جانچ کر کیا جائے گا اور وہاں جواب دہی سوسائٹی یا معاشرے کو نہیں بلکہ فرد کو کرنی ہوگی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مادی زندگی کے اجتماعی ثمرات ہی اصل جزا اور اجتماعی محرومی ہی اصل سزا ہے تو پھر قرآن مجید میں جو یہ ارشادات فرمائے گئے ہیں کہ قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک اس کے پاس تنہا تنہا حاضر ہوگا (مریم، ۹۵) اور جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا (الزلزال۔ ۷، ۸) یہ سب باتیں بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ فرد اور اس کے حقوق کا تحفظ، بحیثیت انسان اس کا احترام، اس کے قول و فعل کی انفرادی ذمہ داری اور اس پر جزا و سزا، یہ سب تصورات جو دین کے مسلّمات ہیں اسی صورت میں بامقصد ہو سکتے ہیں جب یہ تسلیم کیا جائے کہ اصل اہمیت فرد اور اُس کی شخصیت کو حاصل ہے اور اس کے افعال و اعمال کا فیصلہ بھی آخرت میں بحیثیتِ فرد ہی کیا جائیگا ورنہ اس بنیادی حقیقت کا انکار کر کے اگر یہ باور کر لیا جائے کہ اصل چیز اجتماعیت اور اس کے مفادات ہیں اور اعمال کی جو کچھ اہمیت ہے وہ ان اجتماعی مفادات کے حصول کے لیے کوشش اور اس کے ثمرات کی بنا پر ہے، تو پھر کسی فرد کی نیکی، آخرت میں اس کی باز پُرس، اس کا اپنے خالق و مالک سے ذاتی تعلق اور اس کے اپنے مستقل حقوق وغیرہ سب تصورات محض اوہام بن کر رہ جاتے ہیں۔

مذہب میں فرد کی اہمیت

لوگ عام طور پر یہ پوچھتے ہیں کہ مذہب نے فرد کو اس کائنات میں بحیثیتِ فرد اتنی اہمیت کیوں دی ہے۔ اس کا جواب بڑا سادہ اور آسان ہے۔ اگر فرد کو خدا سے بحیثیت فرد تعلق نہ رہے اور اسے اپنے اچھے بُرے اعمال کا خود ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے اور اسے اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ اس کے نیک اعمال کبھی ضائع نہیں جائیں گے اور اس کی بداعمالیاں کبھی گرفت سے بچ نہ سکیں گی تو اس کے اندر مذہبی اور روحانی احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک نیک اور خداترس آدمی کو زندگی میں کس قسم کی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس سے دنیا کبھی بے خبر نہیں رہی۔ اسے راہِ خدا میں ستایا جاتا ہے، اس پر عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے، اس کے مقدس عزائم کی ہر طرف سے تضحیک ہوتی ہے اور اس کے پاکیزہ ارادوں کی تکمیل میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ وہ آدمی بظاہر بالکل ناکام و نامراد نظر آتا ہے لیکن وہ صداقت کے راستے پر گامزن رہتا ہے۔ اس کے دل میں نہ تو جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور نہ انسانیت کے خلاف غیظ و غضب۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر کام کرتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ میرے یہ اعمال دنیا کی نظروں میں خواہ کتنے ہی بے وزن ہوں مگر عنداللہ ماجور وہ ضرور ہوں گے۔ اسی طرح وہ بُرائی سے اس لیے باز نہیں رہتا کہ اسے پولیس اور فوج کا ڈر ہے کیوں کہ اگر یہی ڈر اس کے عمل کا محرک ہو تو اس کے سامنے لاتعداد جرائم کے ارتکاب کے لیے ایسے کھلے اور وسیع میدان موجود ہیں، جہاں نہ تو قانون کا ہاتھ پہنچتا ہے اور نہ معاشرے کی نگاہیں پڑتی ہیں، مگر اس کے باوجود وہ ان کے ارتکاب سے باز رہتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا یقین ہے کہ اس کے افعال و اعمال خواہ انسانوں کی نظر سے کتنے ہی اوجھل اور مستور ہوں، اُس علیم و خبیر ہستی سے چھپے نہیں رہ سکتے جس نے پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ باری تعالیٰ کے ساتھ یہ ذاتی تعلق اور اپنے ذاتی اعمال کے معاملے میں اس سے اجر کی امید اور اس کی سزا کا خوف مذہب کی اساس اور بنیاد ہے۔ اگر یہ عقائد انسان کے دل و دماغ

میں اچھی طرح پیوست نہ ہوں تو انسان کی زندگی میں کوئی مذہبی احساس باقی نہیں رہتا اور اس کی زندگی اس شیریں عنصر سے خالی ہو جاتی ہے جس میں انسان سارے دکھ درد رداقیوں کی سی بے حسی کے ساتھ نہیں بلکہ پورے اطمینانِ قلب اور سکونِ خاطر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔

ذرا غور فرمائیں کہ آپ جب یہ کہتے ہیں کہ ایک فرد صرف معاشرے کے لیے زندہ ہے اس سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں اور اس کی جدوجہد اگر اجتماعی مفادات کے لیے وقف نہیں تو وہ بیکار ہے تو آپ درحقیقت انسان اور خدا کے تعلق کی نفی کرتے ہیں۔ ان حالات میں خدا کا نام یا اس کا تصوّر محض ایک اضافی سی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔

مادّی تہذیب میں فرد کا مقام

الہامی مذاہب کے مقابلے میں مادیت نے انسان کے بارے میں جو تصوّر پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی مستقل اور الگ کوئی حیثیت نہیں اور اس بنا پر وہ اپنے لیے کسی مستقل حق کا دعویدار بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے وجود کے لیے اجتماعیت کا رہینِ منت ہے۔ اسے معاشرے کے لیے زندہ رہنا اور معاشرے ہی کے لیے مرنا ہے۔ اس کا کوئی ایسا عمل قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جو اجتماعی مفاد کے لیے مفید نہ ہو۔ اس کی ساری وابستگیاں صرف اجتماعیت سے ہیں۔ وہ اجتماعیت کا ویسا ہی ایک جُز ہے جیسے مشین کے کل پُرزے اس کے اجزا ہوتے ہیں۔ جس طرح مشین کا کوئی پُرزہ مشین سے الگ اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا، اسی طرح معاشرے کا کوئی فرد بھی معاشرتی مفادات سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنی کوئی الگ شخصیت نہیں رکھتا جس کے اپنے کچھ مستقل تقاضے ہوں اور جس کے آزادانہ عمل کے لیے اجتماعی زندگی میں کوئی جگہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں انسان کا کوئی عمل اگر اپنے اندر کوئی معنویت رکھتا ہے تو صرف اس بناء پر کہ وہ معاشرے کے اجتماعی مفاد کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت رکھتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کے حامیوں کے نزدیک ایک فرد کی اوّل تا آخر وفاداری معاشرے سے ہے۔ خالق و مالک سے تعلق ایک اضافی چیز ہے۔ جس کے لیے اجتماعی زندگی میں کوئی گنجائش چھوڑنا

یا نہ چھوڑنا اور کتنی گنجائش چھوڑنا بالکل کسی معاشرے کے برسراقتدار طبقے کی مرضی پر منحصر ہے کیونکہ اجتماعی مفادات دوسرے سارے تقاضوں سے زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ پسندیدہ عمل، وہ عمل ہے جو اجتماعی مفادات کے لیے کارآمد ہو۔ اچھا اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے معاشرے کو مادی فوائد حاصل ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ حضرات زبان سے اس بات کو صاف صاف تسلیم کرنے میں متامل ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک معاشرہ ان کا خدا، اس کے مفادات ان کا ایمان، ان مفادات کے لیے تگ و دو ان کا عملِ صالح اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مادی فائدے ان کی جزا ہیں۔ ایسے معاشرے میں خدا کا تصور ایک تکلف سے زیادہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ جب ایک آدمی یہ فرض کرلے کہ وہ معاشرے کے لیے زندہ ہے اور اس کی مادی فلاح ہی اس کا کعبۂ مقصود ہے تو وہ لامحالہ کوئی روش اختیار کرتے ہوئے صرف یہ دیکھے گا کہ کیا اس سے وہ اجتماعی مقصد حاصل ہو سکتا ہے جو اس کے پیشِ نظر ہے۔ اس سے اس روحانی اخلاق کی تغلیط ہو جاتی ہے جو مذہب پیش کرتا ہے یہاں باری تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے بجائے اجتماعی مفادات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔

اسلام اور اجتماعیت

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم یہاں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ فرد کے مرتبہ اور مقام کی اس صراحت کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ سارے مذاہب نہ سہی، اسلام تو اجتماعیت پر بڑا زور دیتا ہے اور معاشرتی تقاضوں کو کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ یہ بات ہمیں بھی تسلیم ہے لیکن اس طرح کے اعتراض کرنے والے غالباً اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی احکام بھی فرد کی، روحانی اور اخلاقی نشوونما اور آخرت میں اس کی فلاح و کامرانی کے لیے ہیں۔ وہ مادہ پرستوں کی طرح اجتماعی مفادات کو (جو درحقیقت مادی مفادات ہی ہوتے ہیں) حیاتِ انسانی کا مطلوب و مقصود قرار نہیں دیتا بلکہ اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لیے ایسے پاکیزہ قوانین دیتا ہے جس میں ہر فرد انسانی روحانی اعتبار سے پوری طرح

نشو ونما پا سکے اور اس طرح وہ باری تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب وکامران ہو۔

مملکت سے بڑی اجتماعی قوت دنیا میں کون سی ہو سکتی ہے اسلام نے اس سب سے بڑی اجتماعی قوت کے مقصدِ وجود کی تصریح کرتے ہوئے بتایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج - ۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن و حکومت عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے"۔

یہاں ہیئتِ اجتماعی کی غرض بھی جو کچھ بتائی گئی ہے وہ اخلاقی اور روحانی تربیت، بھلائی کا قیام اور بُرائی کا استیصال ہے۔ مذہب کے اندر فرد کی حیثیت اور اس کے مقابلے میں مادیت کے اندر فرد کے مرتبہ و مقام کو سمجھنے کے لیے آپ پھول اور اینٹ کی مثال پر غور کریں۔ ایک آدمی اٹھتا ہے اور وہ پھولوں کی کیاریاں تیار کرتا ہے، انہیں پانی دیتا ہے، ان میں رنگا رنگ پھولوں کے پودے لگاتا ہے۔ ظاہر بات ہے اس کی یہ محنت محض ایک پھول کی صورت میں تو بار آور نہیں ہو گی، گلستان میں لاتعداد پھول کھلیں گے، ان پھولوں کا اپنے پودوں کے ساتھ گہرا ربط ہو گا۔ ان پودوں کی جڑیں انہیں خوراک بہم پہنچائیں گی۔ لیکن اس گلستان کے نظام کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا مقصد پھولوں کی نشو ونما ہے یا بالفاظ دیگر پھولوں سے پودے اگانے اور انہیں خوراک بہم پہنچانے کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ عمدہ پھولوں کے حصول کو اصل مقصد سمجھ کر گلستان کا پورا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ بالکل یہی صورت مذہب کے اندر ایک فرد کی ہے۔ انسان کو بلاشبہ اجتماعی زندگی کے عین منجدھار میں اتارا جاتا ہے۔ اسے اپنی شخصیت کی نشو ونما کے لیے بہت سی معاشرتی ذمہ داریاں قبول کرنا پڑتی ہیں۔ لیکن یہ سب ذمہ داریاں اور یہ ساری تگ و دَو اس غرض کے لیے ہے کہ اس اجتماعی نظام میں رہنے والے انسانوں کو زیادہ سے زیادہ روحانی اور اخلاقی تربیت دی جائے۔ یہ ہے فی الحقیقت کسی اخلاقی

نظام میں ایک فرد کی حیثیت۔

اس کے برعکس زندگی کا وہ نظام جو مادی نظریۂ حیات پر قائم ہو اس میں فرد اینٹ یا پتھر کے ایک ٹکڑے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اصل مقصد اجتماعیت کے رفیع الشان محل کی تعمیر ہوتا ہے اور اس میں افراد کو جس طرح ضرورت ہو بلا تکلف استعمال کیا جاتا ہے۔ اجتماعیت کے معماروں کے ہاتھ میں فرد بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اس بے چارے کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ اس کے اپنے کوئی مستقل حقوق نہیں ہوتے۔ یہ معمار اپنے منصوبے کے مطابق اسے جس طرح چاہتے ہیں توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی کے مطابق جس مقام پر چاہتے ہیں جوڑ دیتے ہیں کیونکہ اجتماعیت پرستوں کے نزدیک یہی انسان کے وجود کا اصلی اور حقیقی مقصد ہے۔

مختلف فلسفہ ہائے حیات کی آویزش

آپ پوری تاریخِ انسانی پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ فرد کے مرتبہ و مقام کے بارے میں ان دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں آویزش درحقیقت خدا پرستی اور مادہ پرستی کی کش مکش ہے۔ انسانیت کے وہ محسن یعنی انبیاء اور صلحاء جنہوں نے اسے خدا پرستی کا سبق دیا تھا انہوں نے اپنا سارا زور فرد کی روحانی اور اخلاقی نشوونما پر صرف کیا، اور اسے ایک مستقل شخصیت اور واجب الاحترام ہستی سمجھتے ہوئے معاشرے کو اس نہج پر ڈھالنے کی کوشش کی جس سے معاشرہ فرد کی روحانی ترقی میں حائل ہونے کے بجائے اس میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہوتا کہ فرد اپنے خالق و مالک کی اطاعت کے سارے تقاضوں کو کماحقہ پورا کر کے آخرت میں فائز المرام ہو سکے۔

اس کے برعکس مادہ پرستوں نے انسان کو اینٹ اور روڑے سمجھ کر انہیں مادی مفادات کی بلند و بالا عمارات تعمیر کرنے میں صرف کیا۔ انہوں نے انسان کے لیے کسی مستقل حق اور کسی مستقل مرتبہ و مقام کو ماننے سے انکار کیا اور اجتماعی مفادات (جو درحقیقت ایک مخصوص طبقے کے مادی مفادات ہی تھے) کی تکمیل کے لیے اسے بطور آلۂ کار استعمال کیا۔ قرآن مجید میں

فرعون کے طرزِ عمل کے بارے میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ [1] (القصص۔۴)

وہ انسان کے بارے میں اسی مادہ پرستانہ طرزِ عمل کا ترجمان ہے یعنی جس طبقے کو جس طرح چاہا زندہ رہنے دیا اور اس سے جس طرح فائدہ اٹھانا چاہا اٹھاتے رہے۔ وہ طبقہ بے چارا اپنی شخصیت کے تحفظ، اپنی آزادی کے تحفظ اور اپنے انسانی حقوق کے تحفظ سے ہمیشہ محروم ہی رہا۔

یہ طرزِ عمل صرف فرعون ہی کا نہیں دنیا پرست قوموں کی انسان کے بارے میں یہی ایک مستقل روش رہی ہے۔ مگر یہ بھی تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ ان قوموں نے آج تک کبھی اپنے اس مادہ پرستانہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل اور ان کے نتائج اور عواقب کو بطورِ حقیقت تسلیم نہیں کیا اور اس بنا پر انسانیت فکری اور عملی تضاد کا شکار رہی ہے۔ یوں تو اس تضاد کے بے شمار واقعات ہمیں گزشتہ اقوام یعنی قومِ عاد، ثمود، قوم لوطؑ اور بنی اسرائیل میں ملتے ہیں، لیکن ہم اپنی بحث کا آغاز روم اور یونان سے کرتے ہیں، کیونکہ تہذیبِ جدید اسی پرانی مادہ پرستانہ تہذیب کی صدائے بازگشت ہے۔

ان تہذیبوں کی تحلیل و تنقید کرتے ہوئے ان اجزاء کو نظر انداز کر دیجیے جو اصل نہیں بلکہ فروعات و مظاہر ہیں اور جو عام انسانی تہذیبوں کے درمیان مشترک ہیں اس کے بعد ان کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے جس کی مندرجہ ذیل خصوصیات نمایاں ہیں:۔

- غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔
- خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی۔

---

[1] "اس نے ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔ اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔"

- دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد و لذائذ کا شدید اہتمام۔
- حبِّ وطن میں افراط و غلو۔

ہم ان متعدد اجزا اور پہلوؤں کو اگر ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا مادیت کا لفظ کافی ہے۔ مالک الملک سے انفرادی تعلق مفقود ہونے کی وجہ سے یونانیوں کے سامنے دو بڑے اہم سوال تھے۔ ایک یہ کہ ان کے اعمال کے محرکات کیا ہوں اور دوسرے ان اعمال کی نوعیت کا فیصلہ کرنے کے لیے پیمانے اور معیار کون سے ہونے چاہئیں۔ کوئی الہامی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے مادی فوائد کا حصول عمل کا محرک قرار پایا اور اجتماعی مفادات کو اچھے بُرے اعمال کا معیار سمجھ لیا گیا۔

چونکہ انسان کا اپنے خالق و مالک سے کوئی مضبوط رابطہ نہ رہا تھا اس لیے معاشرے کو خدا کی جگہ دے کر اس سے عبودیت کا تعلق قائم کیا گیا۔ یونانیوں نے اس ذہن کے ساتھ زندہ رہنے کے انداز سیکھے کہ انہیں اجتماعی مفادات کے لیے زندہ رہنا اور ان ہی کے لیے جینا ہے پھر انہیں یہ بھی مصیبت پیش آئی کہ ان کے پاس کوئی ایسا روحانی ضابطۂ اخلاق نہ تھا جو انہیں حیاتِ انسانی کی اعلیٰ وارفع قدروں کا پابند بنا کر ان کی اجتماعیت کو قائم رکھتا۔ وہ آخرت کی جزا و سزا کے بھی قائل نہ تھے۔ اس وجہ سے انہیں کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر بھی آمادہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ جو اگرچہ دنیا میں بظاہر بار آور نہ ہو مگر اس دنیوی زندگی کی سرحد کو عبور کر کے انہیں آخرت میں اجر کا مستحق بنا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی داخلی زندگی روحانی سکون سے بالکل عاری اور خارجی زندگی نظم و ضبط سے یکسر محروم تھی۔ ان حالات میں ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ معاشرے کو خالق و مالک سمجھ کر اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں اس طرح ڈال دیں جس طرح ایک بندۂ مومن اللہ کے حضور میں سرِ نیاز جھکا کر اسے یہ کہتا ہے کہ

"میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ تیرے لیے ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔"

اس یونانی معاشرے میں اجتماعی تقاضے دوسرے سب تقاضوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ افلاطون کا یہ خیال تھا کہ شخصی ملکیت، خاندانی تعلقات اور ذاتی مفادات اجتماعیت کی فلاح کے راستے میں حائل ہوتے ہیں اس لیے ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ وہ شخصی ملکیت کو ختم کرنے کی تلقین کرتا ہے، گو اس معاملے میں اس کے نظریات میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ کئی مقامات پر وہ شخصی ملکیت کا کسی حد تک قائل بھی نظر آتا ہے لیکن اساسی تصور یہ ہے کہ اگر کسی فرد کو جائیداد حاصل ہوتی بھی ہے تو وہ معاشرے کی کرم فرمائی ہے اور اسے لازمی طور پر معاشرے ہی کے مفادات کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مفادات سے اس کی مراد صرف مادی مفادات ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائش دولت اور صَرفِ دولت کے معاملے میں مملکت کو آخری اور فیصلہ کن حیثیت دیتا ہے۔

اس فلسفی کے ذہن پر اجتماعیت کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ خاندانی نظام کو بھی اس کے مفادات کے منافی سمجھتا ہے کیونکہ خاندان خود غرضی اور تعصب پیدا کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ عورتوں کو اجتماعی مفادات کے لیے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کون سے مرد انہیں بہادر اور صحت مند بچے جنم دینے میں مدد دے سکتے ہیں اور ایسے مردوں سے جذبۂ افتخار کے ساتھ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس طرح جو نسل پیدا ہوگی وہ پہلی پوری نسل کو اپنا باپ سمجھے گی۔ مملکت کا دائرہ اس حد تک وسیع کر لینے کے بعد اور ایک فرد کو اس کے مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے کے بعد ایک چیز باقی رہ گئی تھی جو اس تہذیب کے علمبرداروں کے لیے سخت پریشان کن تھی اور وہ ضمیر اور روح کا اضطراب تھا۔ اس داخلی بے چینی سے یونانی عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے انہیں خارجی زندگی میں مختلف قسم کی دلچسپیاں مہیا کی گئیں۔ ڈرامہ، شاعری، مختلف قسم کے کھیل اور تہوار یونانیوں کے محبوب مشاغل تھے اور وہ ان سے خوب دل بہلاتے تھے۔

اشتراکیت کا ظہور

اشتراکیت یا دوسرے لفظوں میں مادیت کا یہی ورثہ روم کو ملا۔ اس میدان میں مسلسل اور طویل

تجربات کے بعد اس بات کی پوری توقع تھی کہ مادّی نظامِ حیات معاشرے کی آمریت کا روپ دھار کر انسانیت کو بالکل ختم کر دے گا لیکن اس ملک میں اچانک عیسائیت نمودار ہوئی۔ یہ دین اپنی اصلی قوت کھو دینے کی وجہ سے فکر و عمل کا کوئی عظیم انقلاب برپا کرنے کے قابل تو نہ رہا تھا، اس میں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش بھی ہو چکی تھی، تاہم اس نے مادیت کے ہر آن بڑھتے ہوئے جنون اور اجتماعیت کی خدائی کے مقابلے میں انسانیت کی بے بسی اور بے کسی پر عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ انسان کی فطرت، جسے مادّیت نے بالکل دبا رکھا تھا، کسی حد تک بیدار ہوئی تو اس نے اپنے خالق اور مالک کو پہچاننے اور اس سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ شرک اور بت پرستی کی وجہ سے اہلِ روما خدائے واحد کے ساتھ وہ رشتۂ عبودیت تو استوار نہ کر سکے جس کا فی الحقیقت دینِ حق تقاضا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود خالق کے ساتھ معمولی سے تعلقِ خاطر نے بھی ان کی روح میں زندگی کے آثار پیدا کیے اور اس طرح ان میں اپنی شخصیت، اس کائنات میں اپنے مرتبہ و مقام اور اپنے مستقل حقوق کا احساس بیدار ہوا اور خدا کی معرفت کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے آپ کی بھی پہچان ہونے لگی۔

ان حالات میں اہلِ یورپ عجیب و غریب الجھن میں گرفتار ہوئے۔ مذہبی احساسات انہیں ایک طرف کھینچ رہے تھے اور مادی فوائد کے بارے میں ان کے دل و دماغ ایک خاص نوعیت کے جذبات پیدا کر رہے تھے۔ مگر دوسری طرف مادہ پرستانہ نظریات انہیں حسی خواہشات کی تسکین اور مادی لذائذ کی زیادہ سے زیادہ فراہمی پر ابھار رہے تھے۔ اس طرح یورپ کے اندر جس نظامِ حیات نے تشکیل پانی شروع کی اس میں اوّل روز ہی سے تناقض تھا۔ جس چیز کو آج مفکرین سرمایہ داری کے تناقضات (CONTRADICTIONS OF CAPITALISM) کہتے ہیں ان کی بنیادوں ہی میں تناقض موجود ہے جس کی طرف ہم نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔

یورپ کے عیار دنیا پرستوں نے عجیب و غریب روش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ مذہب کے نام پر انسانیت کے احترام اور فرد کے حقوق کی محافظت کا دم بھرتے تھے اور اجتماعی مفادات کی حفاظت کرنے والے اداروں سے کہتے تھے کہ ان کے انسانی حقوق جو باری تعالیٰ

نے انہیں بحیثیت انسان عطا کیے ہیں۔ ان سے وہ کسی طرح دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہو سکتے۔ معاشرے کو ان کی آزادی کا تحفظ کرنا چاہیئے۔ لیکن خدا سے تعلقِ خاطر کی جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی تھیں انہیں ادا کرنے کے لیے وہ کسی صورت بھی تیار نہ تھے اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کو اپنی ذاتی اور نفسانی خواہشات اور اغراض پر جس طرح چاہتے تھے قربان کرتے رہتے تھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ انہوں نے مذہب کو انسان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی سے عملاً خارج کر دیا اور ساری زندگی مادی فوائد اور مادی تصورات ہی پر استوار ہوئی۔

اس فریب میں آخر انسانیت کب تک مبتلا رہتی۔ مادہ پرستی رگ و پے میں سرایت کر جانے کی وجہ سے لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اصل چیز تو دنیا میں مادی مفادات ہی ہیں۔ اور انسان کو صرف ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ ضمیر، وجدان، روح سب ڈھکوسلے ہیں اور فرد کے احترام کے نام پر جس طرح معاشرے کے عیّار طبقے انہیں بیوقوف بنا رہے ہیں اس فریب کا اب خاتمہ ہونا چاہیئے اور حق و باطل کے مابین کسی ایسے امتیاز کو گوارا نہ کرنا چاہیئے جس کی اساس دنیوی مفادات کے علاوہ کسی دوسری چیز پر ہو۔ ہر وہ چیز حق ہے جو ان مفادات کے حصول کا ذریعہ بن سکے اور ہر وہ چیز باطل ہے جو ان کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو۔

سرمایہ داری اور اشتراکیّت میں عملی تعاون

بعض لوگ سرمایہ داری اور اشتراکیت کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ اشتراکیت درحقیقت سرمایہ داری کی ارتقائی منزل ہے۔ جب زندگی کا مطلوب و مقصود دنیوی مفادات ہوں تو پھر اس راہ میں کسی ایسے اعتقاد، نظریہ یا عمل کو کیوں حائل ہونے دیا جائے جس سے اصل مقصد کا حصول دشوار ہو۔ چنانچہ دیکھیئے کہ اس تضاد کو دُور کرنے کی وجہ سے اشتراکی ممالک چند سالوں میں مادی اعتبار سے اس مقام تک جا پہنچے ہیں جہاں تک

پہنچنے میں سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ملکوں کو ایک طویل مدت تک جد و جہد کرنا پڑی....
اشتراکیت کے ہاں اب معاملہ بالکل صاف ہے۔ انسان کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ اس کی حیثیت معاشرے کے لیے اینٹ اور روڑے کی سی ہے۔ معاشرے کے پیشِ نظر اجتماعی مفادات ہیں۔ معاشرہ ان مقاصد کے لیے افراد کو جس طرح چاہے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے اور جو فرد اس کی کسی خواہش کی تکمیل میں حائل ہو وہ سماج دشمن ہے۔ اس لیے معاشرہ جو بھی سخت سے سخت سزا اسے دے وہ حق بجانب ہے۔ فرد کی روحانی اور اخلاقی نشو و نما کے بجائے اب اسے اس طرح تربیت دی جانی چاہیئے کہ وہ اجتماعی مفادات کے حصول کا مؤثر ذریعہ بن سکے۔

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت صرف ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے دینے کا نام ہے۔ حالانکہ یہ اشتراکیت کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانا تو اس بنیادی اور اساسی اصول کی محض ظاہری علامت ہے جس کے تحت معاشرے کو خدا اور انسان کو اس کا بندہ بنا دیا گیا ہے۔ جس طرح نماز میں انسان رکوع و سجود کر کے باری تعالیٰ کی بڑائی اور اپنے عجز کا اظہار کرتا ہے بالکل اسی طرح افراد کو حقوقِ ملکیت سے محروم کر کے انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا زندگی کے کسی معاملے میں بھی کوئی مستقل حق نہیں ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو سب اجتماعی مفادات کے تابع ہیں۔ ان کی ساری وابستگیاں صرف معاشرے کے لیے ہونی چاہئیں۔ معاشرہ انہیں اگر زندہ رہنے کا حق دے تو انہیں زندہ رہنا چاہیئے اور اگر وہ انہیں اس سے محروم کرے تو انہیں خود بخود بڑی خوشی سے اس سے دستبردار ہونا چاہیئے۔ جس طرح ایک بندۂ مومن خدائی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اسی طرح انہیں معاشرے کی زمام کار سنبھالنے والوں کی دل و جان سے اطاعت کرنی چاہیئے اور ان کے ہر حکم اور فیصلہ کو اسی جذبۂ اخلاص سے قبول کرنا چاہیئے جس طرح خدا کے فیصلوں کو قبول کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں اس کے خلاف کچھ سوچنے کا حق بھی حاصل نہ ہونا چاہیئے۔ اشتراکیت میں معاشرے

سے ماورا کوئی بھی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں۔ اس کے مفادات سے زیادہ کوئی مفاد عزیز نہیں، اس کے حقوق پر کسی دوسرے کا حق فائق نہیں۔ حقِ ملکیت سے محرومی تو محض انسان کی معاشرے کے سامنے عجز و نیاز اور عبودیت کا عملی اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی معاشرے اپنے اس حق کا مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے تقاضا کرتے ہیں۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ دیکھیے کہ ان دونوں نے جن تہذیبوں کو جنم دیا ہے ان میں کس قدر یگانگت اور مماثلت پائی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ تہذیب اور اشتراکی تہذیب میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مذہب بیزاری، پیدائشِ دولت کے لیے اندھا جنون، کمزوروں کے حقوق پر ڈاکے، بین الاقوامی تعلقات میں بے اصولی اور مادی مفادات کی خاطر ہر دوسرے مفاد کی قربانی دونوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آپ گزشتہ پندرہ بیس سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ کیا سرمایہ پرست امریکہ اور برطانیہ اور اشتراکیت کے علمبردار روس کے طرزِ عمل میں کوئی معمولی سا فرق ہے؟ مفادات کا جنون ان سب کو ایک سا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ امریکہ جب اپنے مادی مفادات پر کوئی آنچ آتے دیکھتا ہے تو کوریا اور ویت نام میں انسانی خون سے ہولی کھیلنے لگتا ہے اور لاکھوں معصوم انسانوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے اور روس پر جب یہ جنون سوار ہوتا ہے تو وہ ہنگری اور چیکوسلاویکیہ پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ دستِ ظلم دراز کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی اخلاقی ضابطے کا پابند دکھائی نہیں دیتا۔ انسان اپنے فعل سے، درخت اپنے ثمر سے اور نظامِ حیات اس اجتماعی اخلاق سے پہچانا جاتا ہے جس کا مظاہرہ وہ زندگی کے مختلف معاملات میں کرتا ہے۔ جس طرح ایک خودغرض فرد ناقابلِ اعتماد ہے، بالکل اسی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت کے اجتماعی اخلاق پر کسی طرح بھروسہ نہیں کیا جا سکتا

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے علمبردار ممالک کے درمیان بقائے باہم کا جو اصول طے

کیا گیا ہے یہ کسی انسانیت دوستی کا نتیجہ نہیں بلکہ چوروں کے مابین اس اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ ہے جس کے تحت وہ یہ طے کرتے ہیں کہ تم ایک خاص حدود میں رہنے والے لوگوں کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناؤ اور ہم تم سے تعرض نہیں کریں گے اور ہم دوسری حدود میں جب لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کریں تو تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دو گے۔ مفادات کی پرستش نے ان دونوں نظاموں کے علمبرداروں کو ایک دوسرے کا ہم عناں بنا دیا ہے اور وہ ایک دوسرے کیساتھ ملکر انسانیت کو برباد کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کے درمیان تعاون کی راہیں اب اس قدر کشادہ ہو گئی ہیں کہ مشرقی ممالک اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے معاملے میں تو ان کا طرزِ عمل بالکل ایک جیسا ہے۔

اشتراکیت اس بات سے خوش ہے کہ یہاں لوگوں کے اندر سرمایہ پرستی کا جنون پیدا ہو رہا ہے اور یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ ان کے دلوں سے خدا اور اس کے رسول صلعم کی محبت ختم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ دنیا پرستی لے رہی ہے۔ یہ تبدیلی اشتراکیت کے لیے نہایت خوش آئند ہے۔ دولت کی محبت سے معاشرے میں ذہنی اور اخلاقی خلفشار پیدا ہوتا ہے جسے دُور کرنے کے لیے ریاست کا عمل دخل ناگزیر طور پر بڑھ جاتا ہے اور یہ سب چیزیں اشتراکیت کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ جب یہاں اشتراکیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے تو سرمایہ دار ممالک کو بے حد خوشی ہوتی ہے، کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے کسی دینی معاشرے کی بنیاد منہدم ہو رہی ہے۔

مادی تہذیب اور مذہب دشمنی

خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں میں سے کوئی ایک نظام بھی ایک لمحہ کے لیے مذہب کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام تو خیر ایک انقلاب انگیز دین ہے اس لیے اس کے مقابلے میں مادہ پرستوں کا معاندانہ طرزِ عمل بالکل فطری ہے۔ ان لوگوں نے تو اُن مذاہب کو بھی گوارا نہیں کیا جن کا دائرہ صرف گیان دھیان تک محدود ہے۔ چین نواز اشتراکی جھوٹے پروپیگنڈے کے

ذریعہ مسلمانوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ روسی اشتراکیت مذہب کی دشمن ہو تو ہو مگر اشتراکی چین مذہب کا بڑا خیر خواہ اور دوست ہے اور وہ مذہبی معاملات سے قطعاً تعرض نہیں کرتا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو یہ اشتراکیت کی روح سے قطعاً ناآشنا ہیں یا یہ جان بوجھ کر عوام کو فریب دیتے ہیں۔ جب ایک قوم یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اسے اجتماعی زندگی کو مادی سُود و زیاں کے مطابق تشکیل دینا ہے تو وہ آخر ایسے اصولوں اور نظریات کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے جو اس بنیادی اصول سے مزاحم ہوں۔ ماؤزے تنگ کی منتخب تحریروں میں جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت ملتی ہے کہ اسے مادی نقطۂ نظر کے علاوہ کوئی دوسرا نقطۂ نظر گوارا نہیں۔ ہم یہاں اس کتاب کی پہلی جلد کے صد ۴۶ سے ایک عبارت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کی مذہب دوستی یا مذہب کے معاملے میں "رواداری" کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> "جُوں جُوں کاشت کاروں کی تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے، مذہبی اقتدار ہر جگہ منہدم ہونے لگا ہے۔ بہت سے مقامات پر کاشتکاروں کی انجمنوں نے عبادت گاہوں پر قبضہ کر کے انہیں دفاتر میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ انجمنیں ہر جگہ اس امر کا پرچار کر رہی ہیں کہ ان عبادت گاہوں کی املاک پر قبضہ کیا جائے اور ان کی مدد سے کاشتکاروں کے لیے سکول قائم کیے جائیں اور اس فنڈ سے انجمن کے اخراجات پورے کیے جائیں۔ اس فنڈ کو وہ توہمات کی سرکاری آمدنی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔"

اسی مضمون کے اگلے صفحات یعنی صد ۴۷ اور صد ۴۸ پر ماؤ صاحب مذہب کے بارے میں سرکاری طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ خود عبادت گاہوں کو مسمار کرنے سے گریزاں ہیں مگر عوام کو ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ انہیں خود آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے تباہ کر دیں۔ اپنے اس فلسفہ کی تعبیر میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ انہیں تیر چلّے پر چڑھا دینا چاہیے اور پھر انتظار کرنا چاہیے۔

انسانیت کو مادی تہذیب کے نقصانات

مادی نظامِ حیات کے نقصانات کا شمار تو بہت زیادہ ہے لیکن ہم یہاں چند بڑے بڑے پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں۔

اس طرزِ فکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں رہی جس کی طرف مظلوم دادرسی کے لیے رجوع کر سکیں۔ یا جس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ اپنے مفادات کو نظر انداز کر کے حق اور انصاف کا ساتھ دے گی۔ مغرب کی مادیت پرست قوموں کو دنیوی مفادات نے اس حد تک اندھا کر دیا ہے کہ وہ اپنے افعال اور اعمال کے اخلاقی نتائج سے یکسر بے پروا ہو گئی ہیں اور انہیں اس امر کا کوئی احساس تک باقی نہیں رہا ہے کہ ان کی بے اصولیوں سے انسانیت کو بحیثیت مجموعی کیا نقصان پہنچا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کی بساط پر جو شرمناک کھیل یہ کھیل رہی ہیں اسے دیکھتے ہوئے کسی روشن مستقبل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کی ساری تگ و دَو کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ کسی طرح مشرق بیدار نہ ہونے پائے اور اگر بیدار بھی ہو تو وہ کسی ایسے نظامِ حیات کا علمبردار نہ بنے جس سے ان کے مفادات کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ چنانچہ دیکھیے کہ ان قوموں کے باہمی اختلافات کے باوجود اس ایک مقصد کے معاملے میں ان کے اندر کتنا زبردست اتحاد پایا جاتا ہے۔

امریکہ اور روس میں نظریاتی طور پر جو بُعد ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، لیکن امریکہ کی شہ پر اسرائیل نے عربوں کا جو حشر کیا ہے اور روس نے اس معاملے میں جو مکارانہ روش اختیار کی ہے وہ اخلاقی بے حسی کا سب سے المناک حزنیہ ہے۔ عرب ممالک کے نادان خیر خواہ اور ان کے عاقبت نااندیش حواری جو چاہیں کہتے رہیں اور اپنی کم نظری کو چھپانے کے لیے جو باتیں بنانا چاہیں بناتے رہیں، لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان مفاد کے بندوں پر کسی طرح بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے دنیوی مفادات کو خدا بنا رکھا ہو آخر ان کی پرستش چھوڑ کر حق اور انصاف کیلئے کس طرح کوئی ایثار کر سکتے ہیں۔

اس معاملے میں تو ان قوموں کی بے اصولی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے اس قوم کی پُشت پناہی شروع کی ہے جس کے ساتھ ان کی عداوت ان کی فطرت میں داخل ہے۔ آخر سوچیے کہ یہودیوں کو بالکل بے جا طور پر فلسطین میں بسانے پھر انہیں قوت وطاقت فراہم کرنے اور انہیں مضبوط بنا کر مسلمانوں کو برباد کرانے میں ان قوموں کو بجز اس کے اور کیا فائدہ ہے کہ ان ممالک کی کمزوری سے ان کا تسلط ان پر قائم رہے گا اور انہیں اپنے مفادات کے حصول میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں آخر کونسی چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے؟ پھر یہودی سرمایہ داروں اور محنت کشوں کے غم خوار روسی اشتراکیوں کے مابین کونسے وہ ایسے امور ہیں جن پر اشتراک ہو سکتا ہے؟ یہودی وہ قوم ہے جس نے پورے مغرب کی رگوں سے خون نچوڑ لیا ہے۔ اس کی قوت وطاقت کے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں عاجز ہیں، اور تمام ممالک کے حساس اور دانشمند لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک مختصر سا فتنہ پرداز گروہ جس رُخ چاہتا ہے دنیا کی سیاست اور معیشت کو دھکیل کرلے جاتا ہے اور پوری انسانیت اس کے ہاتھوں میں مجبور اور بے بس ہے۔ لیکن اہلِ مغرب کی عظیم اکثریت اس احساس کے باوجود پھر اسی گروہ کی پذیرائی کرتی ہے اور اس کے اشارے ہی پر سرگرم عمل ہوتی ہے۔

انسانیت کا نہ صرف مغربی قوموں پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے بلکہ انہوں نے حق اور انصاف کی عملداری کے لیے جو ادارے قائم کر رکھے ہیں ان کی بھی کسی حساس انسان کے دل میں کوئی عزت اور وقعت باقی نہیں رہی۔ وہ یہ سمجھنے میں سو فیصد حق بجانب ہیں کہ یہ ادارے مظلوموں اور کمزوروں کی دادرسی کرنے اور غاصبوں سے ان کے غصب شدہ حقوق دلوانے کے لیے قائم نہیں ہوئے بلکہ یہ ظالموں اور چوروں کی منڈلیاں ہیں جہاں ان کی چیرہ دستیوں کو چھپانے اور ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے سامان کیے جاتے ہیں۔ کشمیر اور فلسطین کے معاملے میں اقوامِ متحدہ نے جس بے اصولی، بے حمیتی، جانبداری اور بے ضمیری کا ثبوت دیا ہے اس کی دلفگار داستان سے پوری دنیا واقف ہے۔ کیا عدل وانصاف کے دعویدار اس ادارے کو

اس بات کا احساس نہیں کہ اس نے مظلوم کشمیریوں سے ان کے مستقبل کے بارے میں کیا وعدے کیے ہیں ؟ کیا وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ اسرائیل عربوں پر کس طرح عرصۂ حیات تنگ کر رہا ہے اور ان کے مقدس مقامات، ان کی سرزمین اور ان کے وسائل کو کس طرح نقصان پہنچا رہا ہے ؟ کیا بھارت کے مظلوم مسلمانوں کی دلدوز آہوں اور ان پر مظالم کی وحشت ناک داستانوں سے اس کے کان ناآشنا ہیں ؟ اسے ان سب المیوں کا پوری طرح علم ہے لیکن انہیں جاننے کے باوجود امن کے قیام کی یہ ذمہ دار تنظیمیں آخر کیوں مظلوموں کی دادرسی کے لیے کوئی مؤثر اقدام نہیں کرتیں ؟ کیا مسلمان انسانیت کے دائرہ سے خارج ہیں ؟ کیا وہ پتھر کے ٹکڑے ہیں جنہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا ؟ کیا ان کے مصائب، مصائب نہیں ؟ آخر ان کی مظلومیت، اُن کے دُکھ درد، ان کی محرومیاں اس ادارہ کے شرکاء کے احساس کو کیوں بیدار نہیں کرتیں ؟ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ مفادات کی محبت نے دنیا کی طاقتور قوموں کے لطیف احساسات اور جذبۂ حق پرستی کو بالکل مُردہ کر دیا ہے۔ وہ زندگی کے سارے معاملات کو انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنے مخصوص مفادات اور مصالح کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے انہیں مسلمانوں کے مصائب نظر نہیں آتے کیونکہ یہ ایک ایسی قوم کے مصائب ہیں جو اُن کے استعماری عزائم کی راہ میں کسی وقت بھی رکاوٹ بن سکتی ہے۔

انسانیت کی بقا بنیادی طور پر دو باتوں سے وابستہ ہے۔ ایک رحمت اور دوسرے انصاف۔ جب دنیا سے ان دو صفات کے سوتے خشک ہونے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ برسرِ اقتدار اقوام کو سربراہی کے منصب سے ہٹا کر کسی دوسری قوم کو یہ خلعت عطا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اس بنا پر قوموں کے اندر رحمت کے احساسات کی کمی اور حق اور انصاف کا فقدان درحقیقت ان کی موت کا پیغام ہوتا ہے۔ رحمت کے جذبات انسان اور انسان کے درمیان، انسانوں کے مختلف طبقات کے درمیان، مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان، اور انسان اور کائنات کے درمیان مودّت کے تعلقات استوار کرتے ہیں اور اسطرح انسان

ایک دوسرے کے دشمن بننے کے بجائے رفیق اور مددگار بن کر زندگی بسر کرنے کے انداز سیکھتے ہیں اور باہمی کشمکش کی جگہ باہمی تعاون کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اسی طرح انصاف اور ایکدوسرے کے حقوق کی نگہداشت ہی وہ چیز ہے جو انسان اور انسان کے اندر کشمکش کے اسباب کو ختم کرتی ہے۔ اور انسانیت کو حقیقی امن سے بہرہ ور کرتی ہے۔

مسلمانوں نے مغرب سے جتنے غلط نظریات اور افکار لیے ہیں ان میں ایک تصوّر اس تنازع اور کشمکش کا بھی ہے جو اس کے فلسفۂ اجتماع اور ارتقاء کی جان ہے۔ ہمارے ہاں کے اچھے خاصے بڑھے لکھے لوگ حتیٰ کہ دین دار حضرات تک ان غلط نظریات کی بنیاد پر عجیب وغریب باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ہم یہاں ایک بات بطور مثال پیش کرتے ہیں:۔

مغربی فلسفۂ حیات میں انسان اور انسان کے درمیان اور انسان اور کائنات کے درمیان بنیادی تصوّر باہمی آویزش کا تصوّر ہے۔ اہلِ مغرب کا خیال یہ ہے کہ یہ پوری کائنات ایک رزمگاہ ہے۔ یہاں زندگی کا سارا مدار ہی نزاع اور آویزش پر قائم ہے۔ ایک طرف تمام انواع فطرت کی طاقتوں سے برسرِ پیکار ہیں دوسری طرف مختلف انسانی طبقے اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لیے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ پھر وہ کسر و انکسار کے ذریعہ کسی مفاہمت پر آمادہ ہوتے ہیں اور یہ مفاہمت بھی انصاف پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ جس کی قوت زیادہ ہوتی ہے وہ غالب عنصر کی حیثیت سے اپنی شرائط طے کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی نظریہ نے مسئلۂ ارتقاء، جہد للبقاء، طبقاتی کشمکش، معاشرتی ارتقاء اور مالتھس کے گمراہ کن نظریات کو جنم دیا ہے۔ اب اس غلط تصوّر کی لغزشوں اور تباہ کن اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمارے بعض دانشوروں نے بھی قرآن مجید کی ایک آیت کو، جس میں تسخیرِ کائنات کا ذکر ہے، بنیاد بنا کر یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ فطرت کو مسخر کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت ایک بھری ہوئی اور سرکش قوت ہے جسے طاقت کے زور سے ہمیں مسخر کرنا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس نظام کو اللہ نے تمہارے

لیے مسخر کر دیا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے اس آیت وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہمیں کائنات کے بارے میں یہ تصوّر دیتا ہے کہ ہمیں اس کے خلاف جنگ کر کے بزورِ قوت اسے سرنگوں نہیں کرنا ہے، بلکہ طاقت کے اس اتھاہ خزانے سے فائدہ اٹھانا ہے۔ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف بڑے وسیع اور دُور رس نتائج کا حامل ہے مغربی فلسفے کے مطابق خود غرضی، عداوت، کش مکش، انسان اور کائنات کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہے۔ مگر اس کے برعکس اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق یہ تعلق توافق اور تعاون کی اساس پر استوار ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ کائنات کا یہ سارا نظام جو باہمی تعاون، ہم آہنگی اور عدل کی جیتی جاگتی تصویر ہے اُس کے بارے میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ کشمکش اور کھینچ تان کی بنیاد پر ہو رہا ہے تو اس سے انسانیت کو کتنا عظیم نقصان پہنچے گا۔

آج دنیا کی مقتدر قوموں پر سے انسانیت کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ کیونکہ ان قوموں نے ایک غلط نظریۂ زندگی کے تحت حق اور انصاف کے مسلک کو چھوڑ کر بے انصافی اور خود غرضی کی تباہ کن روش اختیار کر رکھی ہے اور یہی ان قوموں کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح حق اور عدل کے ساتھ کائنات کو پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ دنیا میں ان دو اصولوں کی عملداری قائم رہے۔ یہی وہ دو ایسے اصول ہیں جو انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان توازن پیدا کر سکتے ہیں۔ کسی مفکّر سے پوچھا گیا کہ تہذیب کا بنیادی مسئلہ کیا ہے تو اس نے کہا کہ تعاون اور توازن تہذیب کے دو بنیادی مسائل ہیں۔

آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں مختلف ممالک اور قومیں اس

وقت برباد ہوئیں جب ان کے اندر بھی اور دوسری قوموں کے ساتھ ان کے تعلق میں بھی حق اور انصاف کی بالادستی ختم ہوئی۔ انسانوں کو جس وقت تک اس بات کا یقین رہتا ہے کہ ان کیساتھ حق اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا اس وقت تک وہ ہمت نہیں ہارتے اور معاشرے میں اس شمع کو فروزاں رکھنے کے لیے ایثار سے کام لیتے ہیں لیکن جب ان کے اس اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے تو پھر وہ سارے اخلاقی ضابطوں کو نظر انداز کر کے مفاد پرستی اور خود غرضی کو اپنا رہنما اصول بنا لیتے ہیں اور جلد ہی قوم اور ملک کو لے ڈوبتے ہیں۔ مادیت پرستی کا یہ سب سے شدید نقصان ہے جس پر لوگوں نے بہت کم غور کیا ہے۔

اس کا دوسرا بڑا نقصان دنیا میں اخلاقی بحران ہے۔ اخلاق ضبطِ نفس کا دوسرا نام ہے۔ حکمائے اخلاقیات نے اس کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "اخلاق درحقیقت ان پابندیوں کا نام ہے جو انسان خود اپنے اوپر عائد کرتا ہے"۔ قانون کا ہاتھ خواہ کتنا ہی لمبا ہو انسانی زندگی کے بمشکل ایک فیصد حصے تک پہنچتا ہے۔ باقی ننانوے فیصد گوشے انسان کے اپنے اخلاقی احساس اور ان ضابطوں کے تابع ہوتے ہیں جنہیں انسان حق سمجھ کر خود ان کی پیروی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوموں کو نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لیے مذہبی عقیدے نے ہمیشہ نمایاں خدمت سرانجام دی ہے۔ اخلاقی انحطاط کا چکر یوں شروع ہوتا ہے کہ پہلے قومیں اور افراد خدا پرستی کی جگہ دنیوی منافع اور مفادات کی پرستش شروع کرتے ہیں۔ پھر اپنے اس طرزِ عمل کو جائز اور حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق فلسفے گھڑتے ہیں اور اپنی خود غرضیوں کو چھپانے کے لیے یہ گمراہ کُن نظریات پیش کرتے ہیں کہ انسان کے فطری داعیات پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس سے اس کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ بالکل بے لگام ہو کر اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کرتا ہے تو اس سے معاشرے میں زبردست اختلال پیدا ہوتا ہے۔ اب اجتماعی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے نئی تدبیریں اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس غرض کے لیے ایک طرف تو قانون کے دائرے کو وسیع کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف

افراد پر حکومت کی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انکے سامنے کبھی وطن کا بُت، کبھی قوم اور نسل کا بُت پیش کرکے انہیں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ان معبودانِ باطل میں سے کسی کی بندگی اختیار کرکے اپنی انفرادی اغراض وخواہشات کی قربانیاں دیں اور اپنے اوپر پابندیاں عائد کریں، کیونکہ قانونی جکڑ بندیاں تنہا انسان کو کسی نظم کا پابند نہیں بنا سکتیں۔
جن قوموں نے بھی مادیت پرستی کو اپنی زندگی کا شعار بنایا ہے، وہ اس بات پر مجبور ہوئی ہیں کہ وطن پرستی یا قوم پرستی کا مسلک اختیار کریں، یا دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا کرکے اپنی صلاحیتوں کو کسی تعمیری کام میں کھپائیں۔ لیکن یہ سارے حربے آخر کار بالکل بے کار ثابت ہوتے ہیں اور انسان بربادی کی راہ پر خود بخود بڑھتا چلا جاتا ہے۔

روم اور یونان میں یہ ساری تدابیر اختیار کی گئیں۔ وہاں بھی مملکت پرستی کے سہارے ان قوموں کے انحطاط کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ اجتماعی مفادات کے نام پر سیاست دانوں، شاعروں اور مفکروں نے بڑی دلکش اپیلیں کیں۔ قانونی جکڑ بندیوں کا دائرہ بھی غیر معمولی طور پر وسیع کیا گیا۔ مگر اس تنزل کا کسی طرح بھی تدارک نہ ہو سکا اور ان قوموں کو بڑے عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ساری تدابیر دراصل انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ اللہ کی غیور ذات نے اپنے سوا کسی دوسری ہستی یا چیز کو خدا نہیں بننے دیا ہے۔ انسانوں نے کچھ دیر تو فریب میں آکر قوم اور ملک کو اپنا معبود بنایا اور ان کے لیے ایثار بھی کیا مگر جلد ہی ان کی طبیعتیں اس مسلک سے متنفر ہوگئیں اور وہ اس انداز پر سوچنے لگیں کہ آخر ان کے اپنے ہاتھ کے ان تراشے ہوئے بتوں کو اس بات کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ ان کی نفسانی خواہشات پر کوئی پابندی عائد کریں۔

انسان کی اس غلط روش کے نتائج آج ہم پوری دنیا میں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار میں دیکھ رہے ہیں۔ قتل وغارت، زنا، جھوٹ، فریب، ڈاکہ زنی، چوری اور اغوا کی وارداتوں میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگ یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ انسانی بستیوں میں زندگی نہیں گزار رہے بلکہ جنگل کے اندر درندوں اور وحشی جانوروں کے درمیان اپنے اوقات بسر کر رہے ہیں۔ قانون کا دائرہ ہر آن وسیع ہوتا جا

رہا ہے۔ اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے ماہرین فن مختلف قسم کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ انتظامی مشینری کو زیادہ با اختیار اور منظم کیا جاتا ہے لیکن جرائم کا سیلاب کسی طور تھمتا نظر نہیں آتا اور بڑی سُرعت کے ساتھ انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اخلاق کی یہ بربادی اہلِ مغرب کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ اخلاق سے انسانیت قائم ہے اور جب یہ تباہ ہو جائے تو قومیں جوہرِ انسانیت سے محروم ہو جاتی ہیں اور پھر قدرت انہیں زیادہ دیر تک دنیا میں زندہ رہنے کا موقع نہیں دیتی۔ اسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ انسان اس دنیا میں درندے بن کر رہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں ہم اشتراکی ممالک کے بارے میں ایک خوش فہمی کی حقیقت بھی بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ عام طور پر دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر مادیت پرستی اخلاق کے لیے اتنی ہی تباہ کن ہے جس کا بارہا ذکر کیا جاتا ہے تو پھر اشتراکی ممالک میں جرائم کی رفتار کیوں کم ہے۔ اس کے متعلق تین چار باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ آہنی پردوں کی وجہ سے ان ممالک کے صحیح حالات ہمارے سامنے آنے نہیں پاتے۔ جن ممالک میں اعداد و شمار کا جمع کرنا اور ان کا مرتب کرنا حکومت کے ہاتھ میں ہو وہاں صورتِ حال کا ٹھیک علم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ان ممالک کے اندر بعض افعال جن سے مملکت کو نقصان پہنچے یا اجتماعی مفادات کو خطرہ لاحق ہو ان پر تو زبردست گرفت کی جاتی ہے لیکن ان جرائم کو کسی صورت بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا جو اخلاقی اعتبار سے خواہ کسی قدر گھناؤنے ہوں مگر ریاست کے لیے نقصان دہ تصور نہ کیے جاتے ہوں۔ اس لیے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ جرائم کی کثیر تعداد کو جرم نہ سمجھ کر یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زنا اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک نہایت ہی گھناؤنا جُرم ہے لیکن ان ممالک میں اگر زنا کے اندر جبر کا عنصر شامل نہ ہو تو یہ کوئی جرم نہیں۔ تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ اس وقت ان ممالک نے اپنے عوام کو تشدد کا نشانہ بنا کر، ان پر مختلف قسم کی

پابندیاں لگاکر انہیں قانونی جکڑبندیوں میں جکڑکر اور ان کے دل میں یہ احساس بٹھاکر کہ ساری دنیا انہیں مٹانے کے درپے ہے، انہیں ملکی نظم وضبط کا پابند بنا رکھا ہے اور وہ اس نظام کی قہرمانیوں سے تنگ آنے کے باوجود اسے برداشت کرتے چلے جارہے ہیں۔ لیکن اس قسم کے خوف اور ڈر کے حربے اور اس قسم کے قانونی ہتھکنڈے محض منفی تدابیر ہیں جن سے کچھ مدت تک تو لوگوں کو گرفت میں رکھا جاسکتا ہے مگر ان کے بل بوتے پر انہیں زیادہ دیر تک بااخلاق نہیں رکھا جاسکتا۔ ان تدابیر کے اثرات بڑے عارضی ہوتے ہیں۔ جب لمحے ان ممالک میں قانون کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوگی یا انسان ان جکڑبندیوں اور خوف وہراس کے عادی ہوجائینگے۔ تو یہاں جرائم کی وہی حالت ہوجائے گی جو ہمیں دوسرے مغربی ممالک میں نظر آتی ہے۔ ان وقتی تدبیروں یا عارضی ہتھکنڈوں سے انسانوں نے کبھی انسانیت نہیں سیکھی۔ چنانچہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کی مادہ پرست قومیں اس نازک مقام پر پہنچ گئی ہیں، جہاں تباہی یقینی ہے، الاّ یہ کہ خدا غیب سے ان کے بچاؤ کا کوئی سامان پیدا کردے۔ قانونِ خداوندی کا عام قاعدہ تو یہی ہے کہ اس نے بداخلاق لوگوں کو کبھی دنیا میں دیر تک پنپنے نہیں دیا ہے۔

ساتواں باب

مادی ترقی اور انسان

ہمارے اس دور کے انسان نے سائنسی ایجادات اور اکتشافات میں محیر العقول ترقی کی ہے۔ انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے اس غرض کے تحت کام لینا شروع کیا کہ پیدائشِ دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ اضافہ تو بلاشبہ ہوا، لیکن انسان کو اس سے کیا ملا؟ وسیع پیمانے پر بیروزگاری، مزدور کی آزادی کا خاتمہ، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، طبقاتی کشمکش، استعماریت کا استبداد، خاندانی نظام کی بربادی، اخلاقی اقدار کی پامالی اور جرائم کی زیادتی۔ اگر کثیر پیداداری اور زود پیداداری کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو بحیثیت مجموعی فائدہ حاصل ہو تو کوئی صاحبِ بصیرت بھی موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ مادی تہذیب اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہے۔

جدید انسان نے نقل و حمل اور پیغام رسانی کے ذرائع کو بلاشبہ بہت بہتر بنایا۔ ظاہر ہے کہ اس کی کوشش نیک غرض کے لیے تھی۔ مگر اس بے خدا تہذیب کی موجودگی میں جو نتائج برآمد ہوئے وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔ انسان کے درمیان اخوت کے رشتے قائم ہونے کے بجائے نفرت اور حقارت کی دیواریں حائل ہوگئی ہیں اور انسانیت ایک وسیع برادری

کی حیثیت سے زندہ رہنے کے بجائے مختلف دھڑے بندیوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔ گروہی اور نسلی تعصبات نے انسانی اخوت کے پاکیزہ جذبات کو ختم کر کے رکھ دیا اور انسان جسمانی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب ہونے کے باوجود ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دُور ہو گئے۔ نوعِ بشری کے افراد نے ایک دوسرے کی معاونت اور دستگیری کرنے کے بجائے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دے لیا۔ مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان آج جو عداوت اور دشمنی پائی جاتی ہے اس سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا ان قوموں اور نسلوں کا خمیر ہی انسان دشمنی سے اٹھایا گیا ہے۔ فاصلوں کی کمی اور تباہ کن آلات کی ایجادات نے انسان دشمنی کے اس جذبے کو انتہائی تشویشناک بنا دیا ہے۔ پہلے انسان کو اس منفی جذبے کی تسکین کے لیے بڑی تگ و دَو کرنا پڑتی تھی، لیکن اب حال یہ ہے کہ وہ اپنے دائیں بائیں جھانک کر جس قوم کو چاہتا ہے چشم زدن میں برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ آخر زمین کے گوشے سمٹنے سے انسان کو حاصل کیا ہوا؟ کاش موجودہ دَور کا انسان اس پر سنجیدگی سے غور کرے۔

انسان نے پانی کی یلغار کو روک کر بجلی پیدا کی، فضاؤں میں اڑ کر اپنی بالادستی کو تسلیم کرایا۔ انسان کے یہ کارنامے واقعی حیرت انگیز ہیں۔ پانی کی بپھری ہوئی قوت سرنگوں ہو کر دیوہیکل مشینری کو متحرک کرنے میں استعمال کی جانے لگی۔ آسائشِ زندگی میں اضافہ ہوا۔ مگر ان مشینوں نے احساسِ مروت کو بالکل کچل کے رکھ دیا۔ کارخانہ داروں نے انسانوں کو انسان سمجھنے کے بجائے انہیں مشین کا بالکل بے حس پرزہ گردانتے ہوئے اُن سے معاملہ کیا۔ اُن کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ ہر قسم کے لطیف جذبات سے عاری ہیں۔ اور اپنے اندر کوئی ضمیر نہیں رکھتے۔ وہ عزتِ نفس کے احساس سے یکسر محروم ہیں۔ وہ لوہے کی مشین کی طرح گوشت پوست کی محض ایک مشینیں ہیں جس پر کم سے کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ انسانی مشینیں تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں، اس لیے انہیں معمولی رقم کے بدلے بڑی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

انسان یا مشین

اس نظریے کے مطابق انسان کی قدر و قیمت مشین کی طرح اس کی پیداواری قوت کی نسبت سے متعین کی جانے لگی۔ اگر پیداواری قوت زیادہ ہوئی تو منڈی میں انسان زیادہ قدر و قیمت کا حامل ٹھہرا اور اگر یہ قوت کم ہوئی تو اس کی قیمت میں اچھی خاصی کمی ہوگئی۔ کسی انسان نے یہ نہ سوچا کہ آخر اس ذی روح اور صاحب ارادہ ہستی کو مشین کی سطح پر رکھ کر اس کے ساتھ کیسے انصاف کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے پر کسی نے غور کرنا گوارا نہ کیا بلکہ انسان کے ساتھ مشین کی طرح کا سلوک کرنے پر اصرار کیا کیونکہ اب کسی چیز کی قدر و منزلت کا ایک ہی معیار ہے اور وہ ہے اس کی مادی افادیت۔ اس بنا پر مشین اور انسان دونوں میں سے جو بھی پیدائشِ دولت کے اعتبار سے زیادہ مستعد ثابت ہوا اسے زیادہ مفید خیال کیا گیا۔ تجربے اور مشاہدے نے ثابت کر دیا کہ انسان کی بہ نسبت مشین زیادہ سرمایہ فراہم کر سکتی ہے۔ اس لیے بے جان مشینوں کے لیے تو ہر قسم کے تحفظات کا انتظام کیا گیا مگر "اشرف المخلوقات" کو حوادث کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

بھوک بحیثیت محرّکِ عمل

ماہرینِ فن نے اس اندوہناک صورتحال کا فنی مہارت سے جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس صورتِ حال کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان صحیح معنوں میں اپنے آپ کو مشین ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ قدرت نے اسے ایک خودکار مشین بنایا تھا مگر اس کی حماقت دیکھئے کہ اس نے خواہ مخواہ اپنے دل و دماغ کے اندر بعض مذہبی معتقدات پال کر اخلاقی اور روحانی احساسات کی پرورش کی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مشین بننے میں ناکام رہا اور اسی وجہ سے لوہے کی مشین کے مقابلے میں اسے شکست کھانا پڑی۔

ان میں سے ایک مفکر نے انہیں یہ بتایا کہ وہ غلطی سے اپنے آپ کو کوئی ارفع و اعلیٰ ذات اور اس زمین پر خالقِ کائنات کا خلیفہ سمجھ رہا ہے، حالانکہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے محض

ایک حیوان ہے اور حیوان ہی سے اس نے چند ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ شکل و صورت اختیار کر لی ہے۔ اس وجہ سے اس کی حقیقی ضروریات مذہب و اخلاق نہیں بلکہ پیٹ بھر کر کھانا اور صنفی جبلت کی تسکین کے لیے وسائل اور آزادی ہے۔ اخلاق اور روحانیت سب غیر فطری باتیں ہیں جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں بلکہ اس کے فطری طرزِ عمل میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔

مغرب کی تہذیبی فضا میں انسان نے اس سے گہرا اثر قبول کیا اور جلد ہی باور کرنے لگا کہ وہ واقعی حیوان ہے۔ جب انسان پر حیوانیت کا راز کھلا تو اس نے اپنے عمل کے محرکات کا جائزہ لینا شروع کیا اور تحقیق کے ایسے نوادر پیش کیے کہ عقلِ سلیم سر پیٹ کر رہ گئی۔ انسان کو باور کرایا گیا کہ عمل کا محرک صرف ایک ہے یعنی بھوک۔ پیٹ کی بھوک اور جنسی بھوک۔ اور پھر اس کو برحق ثابت کرنے کے لیے گزشتہ زمانے کے بہترین افراد کے افعال و اعمال کی ایسی غلط توجیہات پیش کیں جن سے ان کے باطل نظریات کی تصدیق ہو سکے۔

ان مفکرین کا مقصود حقیقت کی تلاش نہ تھا بلکہ لوگوں کو اس امر کا یقین دلانا تھا کہ انسان نے حیوانیت کے مرتبہ سے بلند ہو کر نہ کبھی سوچا ہے اور نہ عمل کیا ہے اور انسان کے جن اعمال و افکار کو روحانی اور اخلاقی کہا جاتا ہے وہ دراصل حیوانی محرکات کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

فکر و نظر کی یہ تبدیلی بڑی انقلاب انگیز تھی۔ اس نے اخلاق و شرافت کی ساری اقدار کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں انسان، حیوان سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ضبطِ نفس کی مذہبی تعلیم انسان کے حق میں ضرر رساں خیال کی جانے لگی۔ جدید انقلاب نے انسانی زندگی کی پوری بساط الٹ کے رکھ دی اور انسان نے پورے شعور کے ساتھ حیوانیت کو زندگی کا حقیقی جوہر قرار دے کر اس کے تقاضوں کے مطابق اخلاقی پیمانے متعین کیے۔

جس انسان کے اندر عقل و شعور کی شمعیں روشن ہوں، جس کی فطرت کے اندر وجدان

اور اخلاقی احساس موجود ہو، جس نے صدیوں تک تہذیبِ نفس کے لیے مسلسل جدوجہد کی ہو اسے ان سارے فطری اوصاف سے محروم کر کے حیوانِ محض بنا دینا آسان کام نہ تھا لیکن یورپ میں اس تحریک کو توقع سے زیادہ کامیابی اس وجہ سے ہوئی کہ مسیحی پادریوں نے مذہب کے نام پر جو نارروا اور انسانیت کش پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، ان کے خلاف عوام کو بغاوت کا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ مگر بدقسمتی سے وہ اس معاملے میں توازن قائم نہ رکھ سکے، اور انہوں نے ہر اس چیز کی مخالفت شروع کر دی جس کا کچھ بھی تعلق مذہب سے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق و شرافت اور پاکیزہ جذبات اور روحانی احساسات سب کو مذہب دشمنی کا یہ دھارا اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔

مزید براں گوشت پوست کے انسان کے اندر جو روحانی انسان موجود ہے اس کے وجود کی نفی کی گئی اور انسان کو بہتر اور شادکام زندگی بسر کرنے کے لیے اپنی خارجی زندگی میں خوش آئند تبدیلی پیدا کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اس تبدیلی سے مراد مادی حالات کی تبدیلی ہے۔ یعنی یہ فرض کر لیا گیا کہ انسان کو دولت کی جس قدر زیادہ مقدار میسر آئے گی، وہ اسے اخلاقی اعتبار سے بھی بہتر بنائے گی۔ اس طرزِ فکر نے انسان کی توجہ کو داخل سے ہٹا کر خارج پر لگا دیا۔ اور اس کے نتیجے میں علمِ طبیعیات کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور انسان اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا کہ اس کی اصل کامیابی یہی ہے کہ وہ عالمِ طبیعیات کا زیادہ سے زیادہ دلچسپی سے مطالعہ کرے۔

آفاق پر غور و فکر کو مذہب نے بھی خاصی اہمیت دی ہے۔ آفاق میں پھیلی ہوئی آیاتِ الٰہی پر غور کر کے اللہ پر ایمان اور یقین کو مستحکم کیا جاتا ہے۔ مذہبی اندازِ فکر کیمطابق آفاق کی نشانیاں حقیقتِ کبریٰ کی عظمت کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں مگر مادی تہذیب کے پرستار نے خالقِ کائنات کے وجود پر ان محسوس شواہد ہی کو حقیقتِ کبریٰ سمجھ لیا اور اس امر کا یقین کر لیا کہ جو شے بھی ان کی گرفت میں نہیں آسکتی یا جو مادی نقطۂ نظر سے کسی اہمیت کی حامل نہیں

وہ محض واہمہ ہے۔ اس طرح خدا، آخرت، حشر و نشر، جنت، دوزخ، وحی، ضمیر، وجدان، روح اور اخلاقی احساس سب کی نفی کر دی گئی۔

چنانچہ آپ دیکھئے کہ جدید انسان کا ذہن اعداد و شمار، تجربات و مشاہدات کے طلسم ہوشربا میں اس طرح اُلجھ کر رہ گیا ہے کہ اس کی نظر سے انسانیت کے لطیف احساسات، پاکیزہ جذبات اور اعلیٰ اخلاق کے سارے پہلو اوجھل ہو گئے ہیں اور سائنس سے انسانیت نے اس قدر بھی فائدہ نہیں اٹھایا جو اس سے فی الواقع اٹھایا جا سکتا تھا۔

سائنس کی لغزشیں

یہ وہ بدیہی حقائق ہیں جنہیں مشرق کی مذہب پرست اقوام ہی تسلیم نہیں کرتیں بلکہ جن کا خود مغرب کے بعض نہایت اونچے اور ذہین انسانوں نے بھی بڑے واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلی شہادت مشہور سائنس دان الیکس کیرل کی نقل کرتے ہیں۔ یہ بالغ نظر مفکر کئی برس تک راک فیلر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ریسرچ کے شعبۂ تحقیق میں کام کرتا رہا۔ اس اثنا میں جب اس نے سائنس کے مختلف شعبوں کا مطالعہ کیا تو اسے اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ تہذیبِ جدید کی تعمیر میں سائنس کے جن اصولوں سے کام لیا گیا ہے وہ بڑے ناقص ہیں۔ اس وجہ سے اس تہذیب میں بھی کئی قسم کے اسقام موجود ہیں جو انسانیت کی صحیح اور متوازن نشو و نما کے راستے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اس سقم کی بنیادی وجہ الیکس کیرل کے نزدیک یہ ہے کہ سائنس کے وہ اصول جن کا تعلق بے جان مادہ سے ہے، انہیں سائنس پر بے جا اعتماد کی وجہ سے ذی روح اور با شعور انسانوں کے تہذیبی، معاشرتی اور روحانی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی اندھا دھند استعمال کیا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی بڑی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے۔ اس کی گہرائی کی کوئی انتہا نہیں اور اس کی وسعت کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جو لوگ بھی حیاتِ انسانی کو مجرد سائنس کے اصولوں سے

حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ہمیشہ انسانیت کو غلط اور تباہ کن راستوں پر دھکیل دیتے ہیں۔ برق و باراں کے مشاہدات سے، یا خلاء میں سفر کرنے سے، یا ایٹم کے تجربات سے من کی دنیا کے رازہائے سربستہ معلوم نہیں کیے جا سکتے۔ اس دنیا کے اپنے اصول اور ضابطے ہیں، یہاں تحقیق و جستجو کے کچھ دوسرے قوانین ہیں، یہاں پیمائش کے کچھ الگ پیمانے ہیں۔ اس دنیا کا مسافر سفر کرنے کے لیے جس نوعیت کا سامان فراہم کرتا ہے وہ اس سے مختلف ہوتا ہے جو چاند کی طرف پرواز کرنے والے اپنے لیے آج بالعموم مہیا کر رہے ہیں۔ خلاء میں اڑنے والے اپنے سفر کا آغاز اپنے آپ پر اور اپنے وسائل پر بے جا خوش اعتمادی سے شروع کرتے ہیں، اور چند ہزار میل کا سفر طے کرنے کے بعد (جس کی حیثیت اس وسیع و عریض کائنات میں ذرہ کے برابر بھی نہیں) کم ظرفوں کی طرح پکار اٹھتے ہیں کہ انہیں خداوند تعالیٰ کا کہیں نشان نہیں ملا۔ عقل کے یہ اندھے خلاء میں اڑتے ہوئے زمین کے چاروں طرف نیلگوں ہالہ دیکھتے ہیں۔ روشنی سے تاریکی اور تاریکی سے روشنی میں جانے کے کئی مراحل طے کرتے ہیں۔ کبھی کبھی دنیا کو اپنے سروں پر لٹکتا ہوا پاتے ہیں اور یہ سوچنے بھی لگتے ہیں کہ آخر یہ کس چیز کے سہارے معلق ہے لیکن قدرت کے ان مختلف مناظر کے حسن و دلکشی، صنعت گری، پختہ کاری اور حیرت انگیزی کے ثبوت پر ثبوت ملنے کے باوجود وہ خالقِ کائنات کے ادراک سے عاجز ہی رہتے ہیں۔ ان کور چشموں کے برعکس من کی دنیا کے مسافر کائنات کے ہر ذرہ کو، اپنے جسم کی ساخت کو وجود باری تعالیٰ پر قوی شہادت سمجھتے ہیں اور انہیں جب کبھی قلب و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے تو جہاں ایک طرف انہیں اپنی بے بسی، عجز اور درماندگی کا اعتراف ہوتا ہے وہاں ایک "دیکھے بھالے، بن سوجھے، جانے پہچانے، بن بوجھے" قادرِ مطلق کے وجود کا بھی احساس ہوتا ہے۔

اپنے حدود کا صحیح احساس اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کی وسعت کا ٹھیک اندازہ ہی ایک انسان یا قوم کو حق کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی

حیثیت اس وسیع کائنات میں اتنی بھی نہیں جتنی کہ پانی کے ایک قطرہ کی سمندر میں ہوتی ہے۔ پھر خود انسانی زندگی کے بیشمار گوشے ایسے ہیں جن کا مجرّد عقل احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس چھوٹے سے حیرت انگیز کارخانہ میں اتنے لاتعداد عوامل کام کرتے ہیں کہ ان کا جاننا یکسر ناممکن ہے۔ انسان اگر ایک طرف شعور کے تحت سرگرم عمل ہوتا ہے تو دوسری طرف ان گنت غیر شعوری اور لاشعوری عناصر اُس کی زندگی میں ہر وقت کارفرما رہتے ہیں۔ ان حالات میں یہ دعویٰ کرنا کہ سائنس کے اصول ہمہ گیر ہیں اور وہ انسانیت کے ہر مسئلہ کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کر سکتے ہیں، ایک احمقانہ جسارت ہے۔ اسی جسارت پر الیکسس کیرل اور اس کی طرز پر سوچنے والے دوسرے مفکّرین نے واشگاف الفاظ میں گرفت کی ہے۔ چنانچہ الیکسس کیرل اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"وہ علوم جن کا تعلق بے جان مادے سے ہے اور وہ علوم جو انسانی زندگی سے بحث کرتے ہیں، ان کے درمیان عجیب وغریب تفاوت پایا جاتا ہے۔ ذی روح مخلوق کا علم خصوصاً انسان کے بارے میں جو معلومات ہمیں آج تک حاصل ہوئی ہیں، اُن میں نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ یہ علم ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔ انسان انتہائی پیچیدہ مشین ہے اس لیے اس کی زندگی کی کوئی آسان اور سادہ تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ انسان نے ابھی تک ایک طریقہ بھی ایسا دریافت نہیں کیا جس کی مدد سے پوری انسانی زندگی، یعنی اس کے مختلف شعبوں اور ان کے باہمی زندگی سے تعلق کو کماحقہ سمجھا جا سکے۔ ہماری جہالت بلاشبہ بہت زیادہ اور افسوسناک ہے، تہذیبِ جدید اب دورِ ابتلا سے گزر رہی ہے، یہ ہمارے مسائل کو حل کرنے سے عاجز ہے، اس کی تعمیر نوعِ بشری کے متعلق صحیح علم کے مطابق نہیں کی گئی بلکہ اسے سائنس دانوں کے اوہام نے، جنہیں وہ اپنے انکشافات سمجھ بیٹھے ہیں، عام انسانوں کی

حیوانی خواہشات نے اور غلط تصورات نے جنم دیا ہے۔ ہم خود اس تہذیب کے معمار رہیں، لیکن یہ ہمارے مناسب حال نہیں ....

ہمارے علوم کا مرکز و محور انسان ہونا چاہیئے، لیکن انسان ہی آج کل اس دنیا میں سب سے زیادہ اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ دنیا کے معاملات کو احسن طریق سے حل کرنے میں سخت ناکام رہا ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت سے ناآشنا ہے۔ بے جان مادہ سے تعلق رکھنے والے علوم نے اس دور میں ذی روح انسانوں سے بحث کرنے والے علوم پر حیرت انگیز سبقت حاصل کر لی ہے اور یہی انسانیت کا سب سے بڑا زیاں ہے۔"

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فاضل مصنف نے اس حقیقت کو بھی بڑی عمدگی سے بے نقاب کیا ہے کہ تہذیبِ جدید نے انسان کے نقطۂ نظر کو بڑا محدود بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کا بھی پوری طرح جائزہ نہیں لے سکتا۔ لیکن اس زعم میں گرفتار ہے کہ اس کا علم زندگی کی ساری وسعتوں پر محیط ہے۔ اس سلسلہ میں الیکس کیرل لکھتا ہے:

"ہم بسا اوقات بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر کے، بعض کو غیر معمولی اہمیت دے بیٹھتے ہیں.... ہر ماہر فن، اپنے فن سے غیر معمولی لگاؤ اور دوسرے علوم و فنون کے بارے میں بے جا تعصب کی بنا پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کا پوری طرح ادراک کر لیا ہے، درانحالیکہ اس نے اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو کو نگاہ میں رکھا ہوتا ہے اور اس طرح ایک ناقابلِ التفات "جزء" کو غلطی سے "کُل" کے برابر فرض کر لیا جاتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ اجزا بھی کسی ترتیب سے منتخب نہیں کیے جاتے، بلکہ لوگ بغیر کسی نظم کے وقتی جوش سے متأثر ہو کر انہیں

بے سوچے سمجھے چُن لیتے ہیں اور اس طرح باقی پہلو نظروں سے خود بخود اوجھل ہو جاتے ہیں۔"

اندر کے انسان سے صرف نظر اور خارجی زندگی اور اس کے معاملات سے یہ غیر معمولی دلبستگی بلکہ انہماک، اس اندازِ فکر کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے جسے مادی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسان جب عالمِ باطن سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے تو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی اور راہ پر لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے خارجی دنیا کے جھمیلوں میں الجھا دیا جائے تاکہ وہ مصروف رہے۔

سائنسی ایجادات کا غلط استعمال

سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے خارزار کے علاوہ ایک اور میدان جس میں انسان کو مشغول رکھ کر روحانی اور مذہبی احساسات کی عظیم دولت سے بیگانہ رکھا جاتا ہے، وہ سائنسی اور فنی تحقیقات ہیں۔ ہمیں ان تحقیقات اور ان کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن چونکہ یہ تحقیقات اخلاقی اور روحانی احساس سے یکسر عاری ہوتی ہیں، اس لیے ان سے جو قوت بھی حاصل ہوتی ہے اس کا بیشتر حصہ بیکار کاموں، بلکہ تباہ کن کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ آپ جوہری توانائی ہی کو لیجئے اس کی دریافت سے انسان کے ہاتھ میں کس قدر غیر معمولی قوت آئی ہے مگر آج انسان اسے اپنے بھائیوں کی وسیع پیمانے پر ہلاکت اور بربادی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

مادی تہذیبوں کے پیدا کردہ مسائل

اگر روحانی مسائل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے، تو بھی اس وقت دنیا کا سب سے اہم مسئلہ اخلاقی بگاڑ ہے۔ دنیائے مشرق کو جانے دیجیے کہ یہ کرۂ ارضی "غیر مہذب" ہے؛ دنیا کے مہذب ترین ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہاں فی منٹ ایک قتل، فی منٹ ایک ڈاکہ، فی منٹ ایک اغوا جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب ہو رہا

ہے۔ جہاں یہ عالم ہو وہاں لوگوں کی ذہنی حالت جس قدر مخدوش ہو گی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

ان جرائم کے علاوہ لاتعداد مسائل مثلاً بھوک، بیماری، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، استعماری عزائم نے انسانی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں افراد جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے مضطرب نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی، البتہ دوسروں کو ہلاک کرنے کی خاطر نت نئے منصوبے تیار ہوتے رہتے ہیں۔

انسان پر انسان کی چیرہ دستیوں کو روک کر انسان کے لیے بہتر اور شادکام زندگی کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کو ختم کیا جائے۔ اس وقت دنیا میں جو ہمہ گیر فساد بپا ہے اس کی وجہ انسان کی حرص ہی ہے۔ انسان کی خود غرضی نے پوری دنیا کو ظلمت کدہ بنا دیا ہے۔ اگر اس میں اعتدال پیدا کیا جائے تو انسانیت کے بہت سے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ انسان چاند اور مریخ کی طرف تو بڑے جذبے اور شوق سے لپکتا ہے مگر اپنے دل کے اندر جھانک کر فساد کے ان مراکز کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا جنہوں نے اس کی زندگی کو انتہائی پرُخطر بنا رکھا ہے۔ جو لوگ انسان نما حیوان یا انسان نما مشین کو جوہرِ انسانیت سے از سرِ نو آراستہ کرنے کے متمنی ہیں ان پر سب سے پہلا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ان نظامہائے حیات کے خلاف صف آرا ہوں جنہوں نے اسے اعلیٰ و ارفع مقام سے گرا کر ایک مشین یا حیوان کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ ڈارون اور اس کے ہم خیال سائنس دانوں نے انسان کا رشتہ حیوان کے ساتھ جوڑا، اور اسے جنت کی مخلوق کے زمرہ سے نکال کر بندر اور بن مانس کے ساتھ لا کھڑا کیا اور وطنیت اور قومیت کے نام پر اس سے حیوانوں کی طرح بے دریغ کام لیا جانے لگا۔

اس مشینی دَور میں انسان کے دل میں یہ خیال جاگزیں کیا گیا کہ ہر دَور کے معاشی حالات ہی اس وقت کی زندگی کی صورت گری کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہر دَور کی سیاست،

معیشت، پیدائشِ دولت کے طریقوں کی مظہر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی معاشی قوتوں کی کرشمہ سازی ہے اور وہ جس سانچے میں چاہیں اسے بڑی آسانی سے ڈھال سکتی ہیں۔

یہ ہے زندگی کا وہ مادی تصوّر، جسے مغربی مفکروں نے پیش کیا ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی یعنی اس کے ذاتی احساسات وجذبات اس کے عقائد و تصوّرات، اسکے اخلاقی معیارات ان دانشوروں کے نزدیک ہر دَور کے معاشی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی افکار و نظریات یا معتقدات میں کوئی بھی چیز مستقل قدر و قیمت کی حامل نہیں اور انسان کے اندر کوئی ایسا جذبہ یا احساس موجود نہیں جسے انسانیت کا پائیدار مستقل اور حقیقی جوہر کہا جا سکے۔ ہر دَور کا اپنا الگ ایمان اور الگ جوہرِ انسانیت ہے جس کا انسان کے روحانی احساسات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے وجود کے لیے سر تا پا پیدائشِ دولت کے طریقوں کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں اس طرزِ فکر نے نہ صرف انسان کا انسانیت کی وسیع برادری سے رشتہ منقطع کر دیا ہے بلکہ اسے انسانیت کی مشترک میراث سے محروم کرکے اسے عملاً اپنے دَور کے معاشرے کی ایک بے حس مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔

آٹھواں باب

انسان کا متاعِ دنیا سے تعلق

ایک مسلمان کے نزدیک حقیقی زندگی تو آخرت ہے، اور وہی اس کا اصل ٹھکانہ ہے لیکن چونکہ اُس حیاتِ جاودانی کا راستہ اس ناسوتی زندگی کی آزمائشوں ہی میں سے گزر کر جاتا ہے اس لیے ایک مسلمان اسے طے کرنے پر مجبور ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دنیا اور اس کے سارے اموال و اسباب عارضی اور ناپائیدار ہیں اور اس بِنا پر اس قابل نہیں کہ ان پر تکیہ کیا جا سکے تو پھر وہ کونسے ایسے سہارے ہیں جن کے بل پر ایک مسلمان اپنی حیاتِ مستعار گزار سکے۔ یہ سوال انسان کی فطرت کا اوّلین اور بنیادی سوال ہے۔ اس لیے اس کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم اور پرانی ہے جتنی خود انسانیت کی زندگی۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں جس کو اس سوال نے پریشان کیا ہو اور اس نے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس سوال کا جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں اور نہ تمدن و اجتماع کا کوئی نقشہ ہی بنا سکتے ہیں۔ اِسی کے ذریعے کفر کو اسلام سے، اطاعت کو بغاوت سے، معصیت کو نیکی اور پرہیزگاری سے ممیّز کیا جا سکتا ہے۔ اسی سوال کا جواب انسان کا اندازِ فکر اور اسلوبِ حیات متعین کرتا ہے۔ اس کی نوعیت ہی پر سیرت و کردار کے مختلف ڈھانچے تیار ہوتے ہیں اور

افکار و تصورات کی صورت گری ہوتی ہے۔ انسان نے آج تک جتنے فلسفے گھڑے ہیں، جس قدر تہذیبوں کو جنم دیا ہے اور جتنے نظامہائے حیات کی تشکیل کی ہے ان سب میں یہی ایک سوال بنیاد کے طور پر کام دے رہا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ معاشرت و معاملات میں، اخلاق و اجتماع میں، سیاست و آئین میں، علم و فلسفہ میں، الغرض حیات انسانی کے سارے مناظر و مظاہر میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی بنیادی سوال کے رُخِ زیبا کا عکس ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں فرد یا قوم نے اس سوال کے جواب کا فلاں پہلو اختیار کیا ہے تو ہم اس کی زندگی کے نقشہ کے تمام خانے از خود بھر سکتے ہیں یا اگر ہم کسی قسم کی زندگی یا تمدن کی خصوصیات پر گہری نظر رکھتے ہیں تو ہم اس امر کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ اُس نے اس سوال کے جواب کا کونسا پہلو اختیار کیا ہے۔

غیر مسلم کا نظریۂ حیات

ایک غیر مسلم کے نزدیک چونکہ اصل زندگی یہی آب و گل کی زندگی ہے اور آخرت کی زندگی محض اعتباری چیز ہے، اس لیے وہ صرف اسی زندگی کے لیے جیتا ہے اور اسی کو مادی اعتبار سے بہتر اور پُر لطف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادی زندگی کی دلفریبیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اسی کو معراجِ انسانیت تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ چیز بے وقعت ہوتی ہے جو اس کے تحت میں نہ آسکے، یا جس کی تصدیق مجرد حواسِ ظاہری سے نہ ہوتی ہو۔ وہ ہر ایسی قوت اور طاقت کا یا تو سرے سے انکار کر دیتا ہے یا اس کے بارے میں بے یقینی میں مبتلا ہو جاتا ہے جو حواس سے بالاتر ہو۔ اور اگر وہ کبھی کسی بالاتر ہستی کا اقرار کرتا بھی ہے تو اس کا یہ اقرار صرف زبان کی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے دل و دماغ اور عملی زندگی پر اس "ایمان" کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے اور اس طرح اس کی زندگی کے حسی رجحان، اخلاق و اعمال

کی حسی بنیاد میں قطعاً کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ وہ صرف لذت و تمتع کے لیے دنیا میں جیتا ہے اور اسی آرزو میں مرتا ہے۔ ایک شاعر نے جس مقصد کو "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کہا ہے وہ مقصد بھی اس شخص یا قوم کی غایت الغایات ہوتی ہے۔

جو فرد یا گروہ بھی اپنے دل و دماغ میں اس دنیا اور اس کے مال و متاع کے بارے میں یہ تصورات رکھتا ہے وہ بالکل فطری طور پر ان مادی اسباب کو اس کائنات کی ہر چیز سے نہ صرف عزیز تر سمجھتا ہے بلکہ انہیں بہت بڑی قوت اور طاقت کا حامل بھی خیال کرتا ہے اور انہی سہاروں پر زندگی بسر کرنے میں وہ اپنی فلاح و کامرانی کا راز دیکھتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے اسے مانے یا نہ مانے مگر دنیا کے یہ مادی اسباب ہی حقیقت میں اس کے معبود ہوتے ہیں اور انہی کے بل پر وہ زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے متعلق مختلف مقامات پر بحث کی گئی ہے۔ سورۂ شعراء میں قوم عاد کے اندازِ زیست کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ الشعراء - ۱۲۹	"کیا تم ہر بلند مقام پر بلا ضرورت ایک یادگار عمارت بناتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو جیسے کہ تمہیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔"

اس دنیوی زندگی پر بحث کرتے ہوئے اسلام ہمیں سب سے پہلے اس کی اصل حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے بیشمار فتنے ایسے ہیں جو اس کو صحیح طور پر نہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں سب سے پہلی ہدایت جو اس نے فرمائی ہے وہ یہ ہے:

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ	دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے۔ حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں

افکار و تصورات کی صورت گری ہوتی ہے۔ انسان نے آج تک جتنے فلسفے کھڑے ہیں، جس قدر تہذیبوں کو جنم دیا ہے اور جتنے نظامہائے حیات کی تشکیل کی ہے ان سب میں یہی ایک سوال بنیاد کے طور پر کام دے رہا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ معاشرت و معاملات میں، اخلاق و اجتماع میں، سیاست و آئین میں، علم و فلسفہ میں، الغرض حیاتِ انسانی کے سارے مناظر و مظاہر میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی بنیادی سوال کے رُخِ زیبا کا عکس ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں فرد یا قوم نے اس سوال کے جواب کا فلاں پہلو اختیار کیا ہے تو ہم اس کی زندگی کے نقشہ کے تمام خانے از خود بھر سکتے ہیں یا اگر ہم کسی قسم کی زندگی یا تمدن کی خصوصیات پر گہری نظر رکھتے ہیں تو ہم اس امر کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ اُس نے اس سوال کے جواب کا کونسا پہلو اختیار کیا ہے۔

غیر مسلم کا نظریۂ حیات

ایک غیر مسلم کے نزدیک چونکہ اصل زندگی یہی آب و گل کی زندگی ہے اور آخرت کی زندگی محض اعتباری چیز ہے، اس لیے وہ صرف اسی زندگی کے لیے جیتا ہے اور اسی کو مادی اعتبار سے بہتر اور پُر لطف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادی زندگی کی دلفریبیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اسی کو معراجِ انسانیت تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ چیز بے وقعت ہوتی ہے جو اس کے تحت میں نہ آ سکے، یا جس کی تصدیق مجرد حواسِ ظاہری سے نہ ہوتی ہو۔ وہ ہر ایسی قوت اور طاقت کا یا تو سرے سے انکار کر دیتا ہے یا اس کے بارے میں بے یقینی میں مبتلا ہو جاتا ہے جو حواس سے بالاتر ہو۔ اور اگر وہ کبھی کسی بالاتر ہستی کا اقرار کرتا بھی ہے تو اس کا یہ اقرار صرف زبان کی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے دل و دماغ اور عملی زندگی پر اس "ایمان" کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے اور اس طرح اس کی زندگی کے حسی رجحان، اخلاق و اعمال

کی حسی بنیاد میں قطعاً کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ وہ صرف لذت و تمتع کے لیے دنیا میں جیتا ہے اور اسی آرزو میں مرتا ہے۔ ایک شاعر نے جس مقصد کو "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کہا ہے وہ مقصد بھی اس شخص یا قوم کی غایت الغایات ہوتی ہے۔

جو فرد یا گروہ بھی اپنے دل و دماغ میں اس دنیا اور اس کے مال و متاع کے بارے میں یہ تصورات رکھتا ہے وہ بالکل فطری طور پر ان مادی اسباب کو اس کائنات کی ہر چیز سے نہ صرف عزیز تر سمجھتا ہے بلکہ انہیں بہت بڑی قوت اور طاقت کا حامل بھی خیال کرتا ہے اور انہی سہاروں پر زندگی بسر کرنے میں وہ اپنی فلاح و کامرانی کا راز دیکھتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے اسے مانے یا نہ مانے مگر دنیا کے یہ مادی اسباب ہی حقیقت میں اس کے معبود ہوتے ہیں اور انہی کے بل پر وہ زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے متعلق مختلف مقامات پر بحث کی گئی ہے۔

سورۂ شعراء میں قوم عاد کے اندازِ زیست کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ	"کیا تم ہر بلند مقام پر بلاضرورت ایک یادگار عمارت بناتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو جیسے کہ تمہیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔"
الشعراء - ۱۲۹	

اس دنیوی زندگی پر بحث کرتے ہوئے اسلام ہمیں سب سے پہلے اس کی اصل حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے بیشمار فتنے ایسے ہیں جو اس کو صحیح طور پر نہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں سب سے پہلی ہدایت جو اس نے فرمائی ہے وہ یہ ہے:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۖ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ	دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے۔ حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں

يَتَّقُوْنَ ۝ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (الانعام: ۳۲)

کے لیے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے"۔

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الاعراف ۱۶۹)

"آخرت کی قیام گاہ خدا ترس لوگوں کیلئے بہتر ہے کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے"۔

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (الرعد: ۲۶)

"اور یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں"۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (العنکبوت: ۶۴)

"اور یہ دنیوی زندگی (فی نفسہ) بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی تو عالمِ آخرت ہی ہے۔ کاش ان کو اس حقیقت کا علم ہوتا"۔

اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

عن انس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اللّٰھم لا عیش الا عیش الاٰخرۃ متفق علیہ

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اے اللہ! اصلی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے"۔

عن المستورد بن شداد رضی اللہ عنہ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما الدنیا فی الاٰخرۃ الا مثل ما یجعل احدکم اصبعہ فی الیم فلینظر بم یرجع (رواہ مسلم)

"حضرت مستورد بن شداد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ایسی ہی نسبت ہے جیسے سمندر میں کوئی اپنی انگلی ڈالے اور دیکھے کہ اس پر کیا تری لگی ہوئی ہے"۔

مومن کی اصل زندگی ـــــ حیات بعد الممات

قرآنِ پاک کی یہ آیات اور سرورِ کائناتؐ کی یہ تصریحات سب اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ ایک مومن و مسلم کی اصل زندگی اس عارضی زندگی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس حیاتِ جاوداں کا راستہ اس دنیوی زندگی کے بیابانوں میں سے گزر کر جاتا ہے اسلیئے ایک مسلمان اس بات کے لیے مجبور ہے کہ وہ اسے طے کرے۔ مگر اسے ہر لمحہ اور ہر لحظہ یہ خیال ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیکھو کہیں اس زندگی کی رنگینیاں اور دلچسپیاں تمہیں مفتوح نہ کرلیں اور تم اس کے مکر و فریب میں آکر اسے منتہائے مقصود نہ سمجھ بیٹھو قرآن حکیم اور احادیث میں اس حقیقت کی طرف مختلف طریقوں سے اشارہ فرمایا گیا ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۔

(الحدید: ۲۰)

"تم خوب جان لو کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی محض لہو و لعب ہے۔ اور ایک ظاہری زینت اور ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے پر تفوق جتلانا ایسا ہے جیسے کہ مینہ برستا ہو اس کی پیداوار کفار کو اچھی لگتی ہے۔ پھر وہ سبزہ زور پر آتا ہے۔ پھر تم اس کو زرد دیکھتے ہو۔ پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے' اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے۔ اور دنیوی زندگی تو محض دھوکے کا سبب ہے۔"

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (الفاطر : ۵)

"اے اہلِ ایمان بے شک اللہ کا وعدہ سچا اور برحق ہے (خبردار) تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ کے معاملے میں کسی فریب میں مبتلا نہ کر دے۔"

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ

یونس : ۲۴، ۲۵

دنیا کی زندگی (جس کے نشے میں بدمست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہوگئی، پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی، اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں، اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔ (تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے۔"

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۤءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ : آلِ عمران : ۱۴

"لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی ہی خوش آیند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔"

قرآن مجید نے صرف اس دنیوی زندگی کی بے حقیقتی کی وضاحت کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے واشگاف الفاظ میں یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اس زندگی پر راضی ہو گئے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے چنانچہ سورۃ یونس میں بالکل واضح الفاظ میں کہا گیا ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۤءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۔ اُولٰۤىِٕكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔

(یونس : ۷،۸)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو گئے اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا۔ ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور طرزِ عمل کی وجہ سے) کرتے تھے۔"

اسی طرح دنیا پرستوں کو گمراہ ٹھہراتے ہوئے انہیں ایک دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے :

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۔ الَّذِيْنَ

"اور سخت تباہ کن سزا ہے قبولِ حق سے انکار کرنے والوں کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو اللہ کے

يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ط اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (ابراہیم: ۲، ۳)

راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ (انکی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھا ہو جائے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

پھر اسی بات کو ایک دوسرے پیرائے میں یوں بیان کیا گیا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۔ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (بنی اسرائیل: ۱۸-۱۹)

"جو کوئی عاجلہ کا خواہش مند ہو، اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں۔ پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا، ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیئے اور وہ ہو مومن تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہو گی۔"

صحابہؓ کرام کا طرزِ عمل

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہؓ اس دنیا اور اس کے فوائد ولذائذ کے بارے میں جو احساسات رکھتے ہیں ان کو مندرجہ ذیل واقعات سے اچھی طرح معلوم کیا جا سکتا ہے:

حضرت عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو جزیہ لینے کے لیے بحرین بھیجا۔ وہ بحرین سے مال لے کر آئے۔ انصار نے سنا کہ حضرت ابوعبیدہ آگئے تو انہوں نے نمازِ فجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کی۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے

تو وہ سامنے آئے۔ آپؐ ان کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، میرا خیال ہے کہ تم نے سن لیا، ابوعبیدہ بحرین سے کچھ لائے ہیں۔ انہوں نے کہا، جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا:

ابشروا واملوا ما یسرکم فواللہ ما الفقر اخشی علیکم ولکنی اخشی ان تنبسط الدنیا علیکم کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلککم کما اھلکتھم۔ (متفق علیہ)	"مبارک ہو اور خوشی کی امید رکھو۔ خدا کی قسم میں تمہارے لیے فقر سے نہیں ڈرتا۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ کہیں تمہارے لیے بھی دنیا اس طرح نہ پھیلا دی جائے جیسے تم سے پہلی امتوں کے لیے پھیلائی گئی تھی۔ پھر تم اس میں لگے رہو جس طرح وہ لگے رہے تھے تو جیسے ان کو ہلاک کیا کہیں تم کو بھی ہلاک نہ کر دے۔"

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے تھے اور ہم سب آپؐ کے گرد بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ان مما اخاف علیکم بعدی ما یفتح علیکم من زھرۃ الدنیا و زینتھا۔ (متفق علیہ)	"مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں میرے بعد تم پر دنیا کی آرائش اور اس کی زینت کھول نہ دی جائے۔"
عن کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی المال (ترمذی)	"حضرت کعب بن عیاضؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔"

اس زندگی کو بے حقیقت اور فانی اور موت کے بعد کی زندگی کو ابدی اور جاودانی سمجھنے کا نتیجہ یہ تھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ ہمیشہ اس

مادی زندگی کی لذتوں سے کنارہ کش رہتے تھے۔ وہ دنیاوی متاع پر ہر قسم کی دسترس رکھنے کے باوجود ایسی فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے جس کی مثال تارک الدنیا راہب اور صحرانشین زاہد بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے دلوں میں کبھی یہ خیال بھی نہ آتا کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ پُر راحت اور پُر آسائش بنانے کی کوشش کریں۔ ان کی ساری دلچسپیاں صرف آخرت کو سنوارنے میں صرف ہوتیں۔ اقامتِ دین کا کام ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اس کام میں ان کا انہماک اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ دنیا کے ہر انہماک کو اس پر رشک آتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بیشتر صحابہ نے اپنی مقدس زندگیوں کو انتہائی فقر و فاقہ میں بسر کیا۔ حضور سرورِ کائنات ؐ نے اس فقر کو اپنی محبت کی ایک بڑی علامت بتایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "دیکھو کیا کہتے ہو۔" اس نے کہا۔ "خدا کی قسم میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں" (تین مرتبہ اسے دہرایا) آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو فقر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بیشک جو مجھ سے محبت کرتا ہے فقر اس کے پاس سیلاب سے بھی زیادہ تیزی سے پہنچتا ہے۔

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگی جس عسرت سے گزری، اس کے نقوش تاریخ کی لوح پر پوری طرح محفوظ ہیں۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ہم یہاں صرف چند واقعات نقل کرتے ہیں جن سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ اس زندگی کو فی الحقیقت کیا حیثیت دیتے تھے۔

ایک بار حضرت عمرؓ کاشانۂ نبوت میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ آپ چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں جس پر کوئی بستر نہیں ہے۔ جسم مبارک پر تہبند کے سوا کچھ نہیں پہلوؤں پر نشان پڑ گئے ہیں۔ توشہ خانہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی مٹھی بھر جَو کے سوا اور کوئی چیز

نہیں۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ ارشاد ہوا کہ عمرؓ کیوں روتے ہو؟ بولے... کیوں نہ روؤں، آپ کی یہ حالت ہے اور قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے اڑا رہے ہیں۔ فرمایا "کیا تمہیں پسند نہیں کہ ہمارے لیے آخرت اور ان کے لیے دنیا ہو"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جائدادیں نہ بناؤ، تم کو دنیا کی رغبت ہو جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے اور ہم اپنے ایک چھپر کی مرمت کروا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "میں دیکھتا ہوں کہ موت اس سے بھی زیادہ قریب ہے"۔

حضورؐ نے جس انداز سے زندگی بسر کی اس کے متعلق ان کی رفیقۂ حیات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت یہ ہے کہ آنحضرت کے گھر والے دو دن متواتر جَو کی روٹی سے سیر نہ ہوئے حتیٰ کہ آپؐ کی وفات ہو گئی۔

جب محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہونے لگے اس وقت کاشانۂ نبوی کی ساری دولت صرف سات دینار تھی۔ ان کے بارے میں بھی حضرت عائشہؓ سے فرمایا "انہیں غریبوں میں تقسیم کر دو۔ مجھے شرم آتی ہے کہ رسولؐ اپنے اللہ سے ملے اور اس کے گھر میں دولتِ دنیا پڑی ہو۔ اس ارشاد کی تعمیل کے بعد گھر کی حالت یہ ہو گئی کہ دونوں جہان کا سردار دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اور گھر میں چراغ جلانے کے لیے تیل تک موجود نہیں۔ چنانچہ روشنی کرنے کے لیے تیل ایک پڑوسی عورت سے ادھار لینا پڑا۔

حضور سرورِ دو عالمؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے رفقائے کار رضی اللہ عنہم نے ایک لمبی مدت تک اسی اندازِ زیست کی نہایت سختی سے پیروی کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک دن پینے کا پانی مانگا تو لوگ شہد کا شربت لے آئے۔ پیالے کو منہ سے لگا کر ہٹا لیا۔ اور رونے لگے۔ جو لوگ پاس بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی رو پڑے۔ تھوڑی دیر کے لیے

چپ ہو گئے، پھر دوبارہ رونا شروع کیا۔ لوگوں نے پوچھا، آخر آپ کیوں رو دیئے۔ فرمایا۔ "مَیں ایک دن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ آپ کسی آدمی کو دھکیل رہے ہیں حالانکہ کوئی شخص آپ کے پاس نہ تھا۔ مَیں نے عرض کی، یہ آپ کس کو دھکیل رہے ہیں فرمایا۔ "دنیا میرے سامنے مجسم ہو کر آئی تھی۔ مَیں نے اس سے کہا کہ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ وہ ہٹ گئی، مگر دوبارہ آئی اور کہا کہ آپؐ مجھ سے بچ کے نکل جائیں تو نکل جائیں لیکن آپؐ کے بعد کے لوگ مجھ سے نہیں بچ سکتے۔" مجھے یہی واقعہ یاد آگیا اور میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ وہ کہیں مجھ سے چمٹ نہ جائے۔

رسولِ امین کے اس یارِ غار نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے ارشاد فرمایا: "بیت المال کے وظیفہ کا حساب کیا جائے جو مَیں نے آج تک وصول کیا ہے۔" جب اس حکم کی تعمیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ رقم کل چھ ہزار درہم یا پندرہ سو روپے بنتی ہے۔ صدیقِ اکبرؓ نے حکم صادر فرمایا کہ میری زمین فروخت کر کے یہ رقم ادا کر دی جائے۔ اسی وقت زمین فروخت کی گئی اور انہیں بیت المال کے بار سے بالکل سبکدوش کر دیا گیا۔

آپ کے خلافت قبول کرنے کے بعد آپ کے مال میں جو اضافہ ہوا تھا، اس میں ایک حبشی غلام، ایک چادر اور ایک اونٹنی تھی۔ ان کے متعلق ہدایت کی کہ میری وفات کے بعد یہ تینوں چیزیں خلیفۂ وقت کے پاس پہنچا دی جائیں۔ رحلتِ مبارک کے بعد جب یہ سامان خلیفۂ ثانیؓ کے سامنے آیا تو حضرت عمرؓ بے اختیار رو پڑے اور کہا: "اے ابوبکرؓ! تم اپنے جانشینوں کے واسطے کام بہت دشوار کر گئے ہو۔"

آپ نے وفات کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت فرمایا: "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔" عرض کیا: "تین کپڑوں میں۔" ارشاد فرمایا: "میرے کفن میں بھی تین کپڑے ہوں۔ یہ دو چادریں جو میرے بدن پر ہیں، دھو لی جائیں اور ایک کپڑا اور بنا لیا جائے۔" حضرت عائشہ صدیقہؓ نے دردمندانہ کہا: "ابّا جان!

ہم اس قدر غریب نہیں ہیں کہ نیا کفن بھی نہ خرید سکیں"۔ ارشاد فرمایا: "بیٹی! نئے کپڑوں کی مُردوں کی بہ نسبت زندوں کو زیادہ ضرورت ہے۔ میرے لیے یہی پھٹا پرانا ٹھیک ہے"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زہد کے واقعات سے کون شخص ناواقف ہے۔ اگر کوئی پُر تکلف کھانے کی درخواست کرتا تو فرماتے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں قیامت میں مجھ سے یہ نہ کہا جائے کہ:

(تم اپنے سارے مزے دنیا میں اڑا چکے ہو اور ان کا لطف اٹھا چکے ہو)

اگر کوئی شخص لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ کیا سارے مسلمان یہ کھاتے ہیں۔ نفی میں جواب ملنے پر اس کو ہاتھ نہ لگاتے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں نے مل کر کہا "امیرالمومنین! خدا نے آپ کو مرتبہ دیا ہے۔ شہنشاہوں کے سفیر آپ کے پاس آتے ہیں۔ اب آپ کو اپنی معاشرت بدل دینی چاہیئے"۔ فرمایا: "افسوس ہے تم دونوں رسول اللہ کی ازواج ہو کر مجھے دنیا طلبی کی ترغیب دے رہی ہو! اے عائشہؓ! تم رسول اللہ کی حالت کو بھول گئیں جبکہ گھر میں صرف ایک ہی کپڑا ہوتا تھا۔ اسی کو آپؐ دن کے وقت بچھاتے تھے اور اسی کو رات کو اوڑھتے تھے۔ اے حفصہؓ! کیا تمہیں یاد نہیں جب ایک رات تم نے رسول اللہ کے بستر کو دوہرا کر کے بچھایا تو آپؐ رات بھر سوئے رہے۔ پھر صبح اٹھتے ہی حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "حفصہؓ! یہ تم نے کیا کیا کہ میرے بستر کو دوہرا کر دیا اور میں صبح تک سوتا رہا۔ مجھے دنیاوی آسائشوں سے کیا تعلق؟ تم نے فرش نرم کر کے مجھے کیوں غافل کر دیا؟

بیت المقدس کا شاہانہ اور فاتحانہ سفر جس شان سے فرمایا وہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ سواری میں ایک اونٹ، سر کھلا ہوا، پاؤں کے لیے رکاب بھی نہیں، جو اونٹ کا نمگیرہ وہی سونے کا بستر، سامان کی جو خرجی وہی سر کا تکیہ، بدن پر گزی کا کرتہ جو پہلو سے پھٹا ہوا۔ اس شان سے وہ سفر کر رہا ہے جو روئے زمین کا

سب سے طاقتور حکمران ہے۔

حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے ایک رفیق ضرار بن حمزہ سے کہا کہ علیؓ کا حال بیان کرو۔ انہوں نے معذرت کی۔ لیکن جب حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا تو انہوں نے جو کچھ بیان کیا اس سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فدائی اس زندگی کے بارے میں کیا طرزِ عمل رکھتے تھے۔ ضرار نے کہا:

"ان کو دنیا اور اس کی بہار اور رونق سے وحشت ہوتی تھی اور رات اور اس کی تاریکی میں دل بہلتا تھا۔ آنکھیں پُر اشک رہا کرتی تھیں، ایک لمبے فکر اور سوچ میں رہا کرتے، لباس وہ پسند آتا جو موٹا ہو، کھانا وہ دل کو بھاتا جو معمولی اور سادہ ہوتا، بالکل معمولی آدمی کی طرح رہتے۔ ہم میں اور ان میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا۔ جب ہم کچھ پوچھتے تو جواب دیتے، جب ہم آتے تو وہ سلام میں پہل کرتے، جب ہم بلاتے تو وہ بے تکلف آجاتے۔ لیکن ان کے یہاں اس تقرب اور ہمارے اس قرب کے باوجود رعب اتنا تھا کہ ہم گفتگو نہ کر سکتے اور خود چھیڑ کر بات نہ کر سکتے، دینداروں کی تعظیم کرتے تھے اور مسکینوں سے محبت رکھتے تھے۔ طاقتور کو ان سے کسی چیز کی امید نہ ہوتی اور کمزور ان کے انصاف سے ناامید نہ ہوتا۔ بخدا میں نے انہیں بعض مواقع پر اس وقت دیکھا ہے کہ رات نے اپنے پردے ڈال دیئے تھے اور تارے ڈھل گئے تھے، وہ اپنی محراب میں کھڑے تھے، ڈاڑھی پکڑے ہوئے مار گزیدہ کی طرح تڑپتے تھے اور اس طرح روتے تھے کہ جیسے دل پر چوٹ لگی ہو گویا کہ میں سن رہا ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں۔ اے دنیا! اے دنیا! کیا مجھ سے چھیڑ کرنے چلی ہے اور مجھ پر تیری نظر ہے، اسکی امید نہ کرنا، کسی اور کو فریب دے۔ میں نے تجھ کو ایسا چھوڑا ہے کہ کبھی تیرا نام

بھی نہ لوں گا، تیری عمر مختصر، تیری زندگی بے وقعت اور تیرا خطرہ بہت ہے۔ ہائے سامانِ سفر کس قدر کم ہے، سفر کتنی دُور کا ہے۔ راستہ کتنا وحشت ناک ہے۔"

یہ ہے اس طرزِ عمل کا صحیح نقشہ جو ایک مسلمان اس عارضی زندگی کے بارے میں اختیار کر کے پیش کرتا ہے آج جبکہ مغربی استیلا نے ہمارے فکر و نظر کے زاویوں کو یکسر بدل دیا ہے اور ہم دنیاوی فوائد و لذائذ کے حصول کے لیے مجنونانہ جد و جہد کو عین ترقی سمجھ بیٹھے ہیں حیاتِ انسانی کی یہ تصویر بلاشبہ ہمیں کچھ عجیب و غریب سی معلوم ہوتی ہے اور ہم بدقسمتی سے اپنے آپ کو اس سے اتنا ہی دُور پاتے ہیں جتنا کہ کوئی دنیا پرست۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جانثاروں نے اسی قسم کے اندازِ زیست کو پسند فرمایا اور اسے ہی امتِ مسلمہ کے افراد کو اختیار کرنے کی تلقین کی۔ سرورِ دو عالم نے زر و مال کے فتنہ کی تباہ کاریوں کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ چونکا دینے کے لیے کافی ہے۔ آپ نے فرمایا، اگر دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے گلہ میں چھوڑ دیئے جائیں اور ان کا ستیاناس کریں تو وہ اتنے خطرناک نہیں جتنی آدمی کے دین کے لیے دولت و عزت کی حرص خطرناک ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس فتنۂ دنیا سے محفوظ و مامون رہنے کے لیے اپنے رب سے بڑی ہی دلسوزی سے یوں التجا کیا کرتے تھے:

لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایۃ رغبتنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا	"اور دنیا کو ہمارا مقصودِ اعظم نہ بنا اور نہ ہماری معلومات کی انتہا اور نہ ہماری رغبت کی منزل مقصود اور ہم پر اس کو حاکم نہ کر جو ہم پر نامہربان ہو۔"

خدا کے حضور عاجزی

اس چند روزہ زندگی کے بارے میں جب

کوئی شخص یہ طرزِ فکر اختیار کرتا ہے تو اس سے نہ صرف اس کی نظر میں آخرت کے مقابلہ میں دنیا بے وزن ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ خدا کی عظمت اور کبریائی کے سامنے اسے اپنی ناتوانی و بے نوائی، فقر و احتیاج، عجز و مسکنت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ پھر اپنے آپ کو اس کائنات کا مرکز نہیں سمجھتا بلکہ ہمیشہ ایک فقیرِ بے نوا کی حیثیت سے دیکھتا ہے وہ اپنے افعال و اعمال پر اترانے کے بجائے خدا کے حضور میں اپنے گناہوں کی معافی کا طلب گار رہتا ہے۔ اس کائنات کے اندر آخر حضور سرورِ دو عالم سے زیادہ کون سی ذات زیادہ پاک اور مقدس ہو سکتی ہے مگر دیکھیے کہ حضورؐ بھی اس کائنات کے خالق کے سامنے اپنی بے بسی کا کس طریق سے اظہار فرماتے ہیں:

اللهم اليك اشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي و هواني على الناس رب المستضعفين الى من تكلني الى بعيد يجهمني او الى عد و ملكته امري ان لم يكن بك على غضب فلا ابالي غير ان عافيتك هي اوسع لي - اعوذ بنور وجهك الذي اشرقت له الظلمات و صلح عليه امر الدنيا والآخرة من ان يحل بي غضبك او ينزل

"بارِ الٰہ! اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں۔ تُو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ عاجزوں کا مالک تُو ہی ہے اور میرا مالک بھی تُو ہی ہے، مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے، کیا بیگانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے۔ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا اور دین کے کام ٹھیک

علىّ سخطك لك العتبى حتى ترضى ولا حول ولا قوة الا بك۔

ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری ناراضی مجھ پر وارد ہو، مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔"

پھر انہی جذبات کا اظہار دوسرے مقام پر اس طرح کیا گیا ہے:

اللهم انك تسمع كلامي وترى مكاني وتعلم سري وعلانيتي لا يخفى عليك شئ من امري وانا البائس الفقير المستغيث المستجير الوجل المشفق المقر المعترف بذنبه اسألك مسئلة المسكين وابتهل اليك ابتهال المذنب الذليل وادعوك دعاء الخائف الضرير، دعاء من خضعت لك رقبته فاضت لك عبرته وذل لك جسمه ورغم لك

"اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں، جیسے بیکس سوال کرتے ہیں تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار عاجز گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں، جیسے خوف زدہ، آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہوئے ہو اور

انفه - اللهم	اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے
لا تجعلنی بدعائك	اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام
شقیا و کن	نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت
بی رؤفا رحیما	رحم کرنے والا ہو جا۔ اے سب مانگے
یا خیر المسئولین	جانے والوں سے بہتر، اے سب دینے
و یا خیر المعطین۔	والوں سے اچھے۔"

ایک دوسری جگہ اس احساس نے مندرجہ ذیل الفاظ کی شکل اختیار کی ہے:

اللهم انی عبدك	"اے اللہ میں بندہ ہوں تیرا اور بیٹا ہوں
وابن عبدك وابن امتك ناصیتی	تیرے بندے کا اور بیٹا ہوں تیری بندی کا۔
بیدك ماض	ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں۔ نافذ ہے
فیّ حكمك عدل فی	میرے بارے میں تیرا حکم اور عین عدل ہے
قضاءك۔	میرے بارے میں تیرا فیصلہ۔"

ان واردات قلبی پر بار بار غور کریں اور دیکھیں کہ یہ کس بزرگ و برتر ذات کی دلی کیفیات کی ترجمانی ہے۔ وہ ذات جو خداوند تعالیٰ کے علاوہ دنیا کی ہر شے سے ارفع و اعلیٰ ہے، وہ اپنے مولا کے حضور میں کس طریق سے سر نیاز خم کرتی ہے۔ وہ مالک الملک کے حضور میں کس انداز سے اپنی بے چارگی اور بے بسی کا اعتراف کرتی ہے۔ کیا وہ دل جو اس قسم کے جذبات کا مبدا ہو، اس میں کبھی غرور و تکبر راہ پا سکتے ہیں؟ یہ انہی احساسات کا نتیجہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کار اخلاق و فضائل کے اوج کمال تک پہنچنے کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو کمزور اور ناتواں سمجھتے رہے۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے، جن سے ان پاکباز اور مقدس انسانوں کی تواضع اور انکساری کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے درخت کے سایہ میں ایک چڑیا کو اچھلتے اور پھدکتے دیکھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس سے فرمایا: "اے چڑیا تو کس قدر خوش نصیب ہے، درختوں کے پھل کھاتی ہے اور ٹھنڈی چھاؤں میں خوش رہتی ہے پھر موت کے بعد تو وہاں جائے گی جہاں تجھ سے باز پُرس نہ ہوگی۔ اے کاش! ابوبکر بھی اس قدر خوش نصیب ہوتا۔" آپ کبھی یہ فرماتے، اے کاش! میں درخت ہوتا، کھالیا جاتا یا کاٹ دیا جاتا۔ کبھی کہتے، اے کاش! میں سبزہ ہوتا اور چار پائے مجھے چر لیتے۔

حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی نے آپ کے سامنے اُن اعمالِ حسنہ کا ذکر کر دیا جو آپ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر انجام دیئے تھے۔ حضرت عمرؓ بے قرار ہو گئے اور ارشاد فرمایا: "مجھے اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تو اس کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ اگر اجر نہ ملے تو عذاب ہی سے بچ جاؤں۔"

ایک دفعہ راستہ پر سے گزر رہے تھے کہ کچھ خیال آیا۔ وہیں آپ زمین کی طرف جھکے اور ایک تنکا اٹھا لیا۔ پھر ارشاد فرمایا: "اے کاش! میں اس تنکے کی طرح خس و خاشاک ہوتا۔ اے کاش! میں پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ اے کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی۔"

ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا۔ "اگر آسمان سے ندا آئے کہ ایک آدمی کے سوا دنیا کے تمام لوگ بخش دیئے گئے ہیں تب بھی میرا خوف زائل نہ ہوگا۔ میں سمجھوں گا، شاید وہ ایک بدقسمت انسان میں ہی ہوں۔"

ایک دفعہ ممبر پر چڑھ کر فرمایا کہ ایک دن وہ تھا کہ میں اپنی خالہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا اور وہ اس کے عوض میں مٹھی بھر کھجوریں دے دیا کرتی تھیں۔ آج یہ زمانہ ہے کہ میں امیر المومنین ہوں۔ یہ کہہ کر ممبر سے اُتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا: یہ تو آپ نے اپنی تنقیص کی۔" بولے: "تنہائی میں میرے دل نے کہا کہ تم امیر المومنینؓ ہو، تم سے افضل کون ہو سکتا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ اپنی حقیقت بیان کر دوں۔"

ایک مرتبہ صدقہ کے اونٹوں کے سخت گرمی میں تارکول لگارہے تھے، کسی شخص نے کہا، کسی غلام سے فرما دیا ہوتا۔ فرمایا، مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہوگا۔

اسلامی نظریۂ حیات کے اثرات

حیاتِ انسانی کے متعلق ان تصورات وافکار اور احساسات و جذبات سے سیرت و کردار کا جو خمیر اٹھایا جاتا ہے وہ ایک طرف تو نسلی اور نسبی تفوق کی ہر آلائش سے پاک ہوتا ہے اور دوسری طرف اس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ جو فرد بھی اس خمیر سے اپنے اخلاق کو غذا بہم پہنچاتا ہے اس کے دل کے تار تمام انسانوں کے دکھ درد کے لیے لرزتے ہیں، اور انسانوں کی معمولی مصیبت کو دیکھ کر ان میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپکو انسانوں کے "ریوڑ" میں فوق البشر نہیں سمجھتا بلکہ انہی کی طرح کا ایک معمولی انسان خیال کرتا ہے۔ اسے کبھی اس بات کا اندیشہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کا دامنِ تقدس عوام کے ساتھ ملنے جلنے اور ان کے مشاغل میں شرکت کرنے سے آلودہ ہو جائے گا بلکہ وہ ہمیشہ اس آرزو میں ہمت آزما رہتا ہے کہ وہ غریب عوام کے ساتھ مل کر ان کی ذہنی، اخلاقی اور دینی سطح بلند کرے۔ وہ محض گلیمِ خویش کو بچا کرلے جانے کی فکر نہیں کرتا بلکہ دوسرے ڈوبتوں کو نکالنے کے لیے بھی مؤثر تدابیر اختیار کرتا ہے۔

پھر اس کے اندر ایک ایسا جوہرِ نایاب ترقی کرتا ہے جسے لوگ انسانیت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ابنائے جنس میں محتسب بنا کر نہیں رکھتا بلکہ ان میں بھائیوں کے رکھوالے کی حیثیت سے رہتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کے ساتھ جانچتا ہے اور ایک اہلِ دل انسان کی طرح ان کی وجہ اور علت معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے زیادہ اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وہ ان اسباب کا کھوج لگائے جنہوں نے اس شخص کو سیدھے

راستے سے ہٹا کر اس غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ وہ جب اپنے سامنے ایک بدبخت مجرم کو دیکھتا ہے تو اس میں تفوق کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس وقت بھی اسے یہ خیال گزرتا ہے کہ اگر توفیقِ الٰہی شامل نہ ہوتی تو کیا عجب کہ آج وہ بھی اسی حالت میں ہوتا جس میں یہ بدنصیب گنہگار مبتلا ہے۔ اسی لیے اسکے دل میں مجرم کیخلاف نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہمدردی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنی اس نیک اور پاکبازانہ زندگی پر اتراتا نہیں بلکہ اس قادرِ مطلق کا شکر بجا لاتا ہے جس کی رحمت سے وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ اس قسم کی سیرت و کردار رکھنے والا شخص اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی صالح فطرت کسی جرم اور گناہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرتی۔ البتہ وہ جو کچھ کرتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں ایک خطِ امتیاز کھینچ لیتا ہے۔ ایک با اخلاق آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ جرم کے تدارک کی فکر کرتا ہے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی سختی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا لیکن بحیثیت ایک انسان کے اسے مجرموں کے ساتھ ایک فطری ہمدردی ہوتی ہے۔ اقبال مرحوم نے اپنے ایک خط میں اس حقیقت کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"شاید نضر نام ایک شخص تھا۔ پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت ایذا دیتا تھا۔ فتح مکّہ کے بعد جب حضورؐ شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمع عام میں آپؐ نے علی مرتضیٰؓ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ ذوالفقار حیدری نے ایک آن میں اس کم بخت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی۔ لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی۔ جس کا قلب تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ تھا اس دردانگیز منظر سے مطلق متاثر نہ ہوئی۔ نضر کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سُنی تو نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی

میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر، اشعار سنے تو حضور اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہِ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نضر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے۔ اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پہ انگلی رکھ کر کہا یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے۔ پھر حکم دیا کہ نضر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے۔"

غرض اس طرح مسلم حنیف قہر و محبت کے متصادم جذبات کو اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے۔

زندگی گزارنے کا اصل سہارا

حضور اکرم رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دعوت کے آغاز میں جن لوگوں سے سابقہ پیش آیا ان میں سے اکثر و بیشتر مادہ پرستانہ تصورِ حیات کے علمبردار تھے: ان کے اعمال و افکار اخلاق و اجتماع میں مادیت پوری طرح نمایاں تھی۔ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے کہ اصل اور حقیقی زندگی یہی مادی زندگی ہے۔ اس کے اسباب ہی زندگی کے سب سے بڑے اور مضبوط سہارے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی ایسی طاقت اور قوت نہیں جو ان کی زندگی کے اس رشتہ کو کاٹ سکے چنانچہ وہ بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ - الجاثیہ ۲۴

"انہوں نے کہا دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور زمانہ کے سوا ہم کو کوئی ہلاک کرنے والا نہیں۔"

اسلام جس طرح ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تم ابنائے دنیا بننے کی بجائے ابنائے آخرت بنو، بالکل اسی طرح ہمارے ذہن میں اس خیال کو راسخ کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ

ہم اگر اس دنیا میں جئیں تو صرف اس ذات کے سہارے جئیں جسے کبھی فنا نہیں، جو ہمیشہ کیلئے رہنے والی ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کی تصریحات جا بجا ملتی ہیں:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ ۔ (الفرقان ۵۸)

"اور تو اس زندہ و جاوید ہستی پر بھروسہ کر جسے فنا اور موت نہیں"

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ التغابن - ۱۳

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (وہی اکیلا مالک و معبود ہے) اور بس اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو توکل کرنا چاہیئے۔"

حضرت ابنِ عباس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا فرماتے تھے:

اللهم لك اسلمت وبك امنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت اللهم اعوذ بعزتك لا اله الا انت ان تضلني انت الحي الذي لا يموت والجن والانس يموتون

"اے اللہ! میں نے تیرے سامنے سر جھکایا اور تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوا اور میں نے تیرے سہارے پر جھگڑا کیا۔ اے اللہ! میں تیری عزت کی پناہ چاہتا ہوں کہ سوا تیرے کوئی معبود نہیں، اس سے کہ تو مجھے بھٹکنے دے۔ تو زندہ ہے نہ مرے گا جن اور انسان سب فانی ہیں۔"

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بڑے بلیغانہ انداز میں اس حقیقت کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں کہ ہمیں اس ذات پاک کے سہارے زندگی بسر کرنی چاہیئے جسے موت نہیں چھو سکتی۔ آخر اس سے زیادہ بیوقوف انسان دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی ہی طرح کی فانی چیزوں پر تکیہ کر کے زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرے۔

توکل کے معاملے میں دوسری چیز جو ہمیں قرآنِ پاک کے مطالعہ سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ

بھروسہ اسی ذات پر کرنا چاہیئے جو سب سے زیادہ قوی، طاقت ور اور دنیا کی ہر چیز پر غالب ہے جس کے فیصلے سب فیصلوں پر حاوی ہیں اور جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہو سکتی سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران - ۱۵۹، ۱۶۰)

"پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے۔ اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا۔ اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔"

پھر اسی مضمون کو سورۃ انفال میں اس طرح بیان کیا ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ (الانفال - ۶۱، ۶۲)

"اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے۔ اسی نے اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔"

یہود کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر بڑا فخر اور ناز تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قوت اور طاقت کے ان خزانوں کے مالک ہونے کی وجہ سے کوئی ان کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ اس کی ذات سے زیادہ علم کس شخص کو حاصل ہے اور اس سے بڑھ کر کون قوت و طاقت کا مالک

ہے اس لیے تمہیں ان لوگوں کو پرِ کاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دینی چاہیئے اور جو بات سچی ہے اسے بغیر کسی خوف کے صاف صاف بیان کر دینا چاہیئے:

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ أَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ وَإِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ

"بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں۔ اور بے شک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ بے شک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا۔ اور وہی غالب اور جاننے والا ہے تو خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک تو کھلے حق پر ہے۔"

اس کائنات کے خالق اور مالک پر بھروسہ اور اعتمادیوں تو ایمان کی جان ہے، اور ایک مسلمان کو اپنی پوری زندگی صرف اسی ایک سہارے پر بسر کرنی چاہیئے، لیکن اس توکّل کی حقیقی قدر و قیمت اور اہمیت انسان کو اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کی زندگی پر آبنے اور مادی اسباب نہ صرف اس کا ساتھ چھوڑ دیں بلکہ اس کے جان لیوا بن جائیں۔ یہی وہ حالات ہوتے ہیں جب ایک مسلمان کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ جب قدرت خود دیکھتی ہے کہ اسے اپنے خالق اور مالک پر کس قدر بھروسہ ہے اور دنیاوی اسباب پر کتنا اعتماد ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا:

حَسْبُنَا اللّٰہ ونعم الوکیل "ہم کو بس اللہ ہی کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے۔"

اسی طرح حضرت ابوبکر صدّیقؓ سے روایت ہے کہ جب ہم مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ گزیں تھے تو مشرکینِ مکّہ ہمارے

سروں پر آ گئے۔ میں نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے قدم کے نیچے دیکھے تو ہم کو دیکھ لے گا۔ آپ نے بڑے ہی سکون اور اعتماد کے ساتھ فرمایا:

ما ظنك يا ابا بكرٍ باثنين الله ثالثهما	"اے ابوبکر تم ایسے دو کے متعلق کیا گمان کرتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔"

نواں باب

صبر و توکّل

" تقدیر میں لکھے ہوئے مصائب کے پیش آنے پر حق تعالیٰ جل جلالہٗ پر اعتراض کرنا موت ہے دین کی، موت ہے توحید کی اور موت ہے توکّل و اخلاص کی۔ قضا و قدر پر شکوہ و شکایت ہوئی تو نہ دین باقی رہا نہ توحید قائم رہی، نہ توکّل رہا اور نہ اخلاص رہا۔ جس دل میں شمعِ ایمان فروزاں ہو وہ چون و چرا کرنا جانتا ہی نہیں، وہ تو صرف ہاں کہا کرتا ہے، مقدر سے جو بھی تکلیف پیش آئی ہو، اس پر راضی ہوتا اور دل سے کہتا ہے کہ ہاں ضرور ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ایک مردِ حق آگاہ نے توحید کے مقتضیات ذہن نشین کراتے ہوئے اپنے رفقا سے کہے تھے۔ ان چند جملوں میں ایمان باللہ کے تقاضوں کو اس عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں۔ اللہ پر توکّل ایک ایسی سیرت و کردار کی صورت گری کرتا ہے جس کے اگرچہ بے شمار مظاہر ہیں۔ لیکن اس کی نمایاں صفات صبر اور تسلیم و رضا ہیں۔ ایک مومن جب اپنی زندگی کا واحد سہارا اللہ تعالیٰ کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کی حالت اس مسافر کی سی ہو جاتی ہے جسے نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہو اور

نہ کف بدہن موجیں اسے ہراساں اور پریشان کرتی ہوں ۔ فتح مندیاں اور کامرانیاں جب اس کے قدم چومتی ہیں تو وہ اتراتا نہیں بلکہ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ اور اسی طرح جب ناکامیاں اور نامرادیاں اس کے حصّے میں آتی ہیں تو وہ نوشتۂ ایزدی پر برہم ہونے کے بجائے صبر وضبط سے کام لیتا ہے اور مالک الملک سے حالات کا رُخ پھیرنے کی دعا کرتا ہے۔

اگر اس معاملہ کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ صبر یا تسلیم و رضا ہی ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے توکّل علی اللہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے خالق اور مالک کا جس قدر زیادہ معتقد ہوگا، اسی تناسب سے اس میں تسلیم و رضا موجود ہوگی۔ صبر و ضبط یا تسلیم و رضا اللہ پر توکّل کی عملی تعبیر ہے۔ جو چیز عقیدہ کی شکل میں توکل علی اللہ کہلاتی ہے وہی جب انسانی اخلاق میں جلوہ گر ہوتی ہے تو صبر یا تسلیم و رضا کا نام پاتی ہے۔ یہ صفات انسان کے اندر اس وقت تک موجود رہیں گی جب تک کہ اسے اپنے خدا پر یقین اور بھروسہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس چیز پر بیحد زور دیا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔
(سورۂ آلِ عمران ۲۰۰)

"اے ایمان لانے والو! صبر سے کام لو۔ باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ۔ حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤگے"۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ صبر کرنیوالوں کیساتھ ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (سورہ بقرہ ۱۵۳)

"اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

اسی طرح ایک حدیث میں اس حقیقت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح فرمایا گیا ہے:

عجب لامر مومن ان امره کله له خیر ولیس ذلک لاحد الا المومن ان اصابته سرّاء شکر فکان خیرًا وان اصابته ضرّاء صبر فکان خیرًا (مسلم)

"ایمان دار آدمی کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور یہ چیز سوائے مومن کے اور کسی کو میسر نہیں۔ اسے جب خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے۔ اور یہ اس کے لیے خیر ہے۔ اور جب اس پر تکلیف یا مصیبت آتی ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔"

صبر کی اہمیّت

صبر کے معنی روکنے اور سہنے کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا۔ یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے۔ صبر کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔ اشتعال انگیز حالات میں قوت اور طاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بے قابو نہ ہونے دینا صبر ہے۔ مخالفین کی زیادتیوں اور اتہام تراشیوں کو سکونِ خاطر کے ساتھ نظر انداز کر دینا صبر ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ مزمل۔۱۰

"ان کی باتوں پر صبر کرو اور خوب صورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔"

صبر، راہِ خدا میں جدوجہد کے لیے ایک لازمی صفت ہے۔ دنیا میں آج تک بھلائی کی خواہش اور اس کے نفاذ کو دنیاوی مفاد کے پرستاروں نے آسانی سے برداشت نہیں کیا۔ بگاڑ پیدا کرنے والوں نے اس کی ہمیشہ پوری شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور جو لوگ اس راہ میں نکلے ہیں ان پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے ہیں۔ ان حالات میں اگر اہلِ خیر صبر کا دامن چھوڑ دیں تو وہ اپنے مقدس مشن کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ (الشوریٰ۔ ۴۱تا۴۳)

"جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد انتقام لے اس پر کوئی گرفت نہیں، گرفت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ بڑے ہی حوصلے کا کام ہے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام نے صبر و ثبات کو کیوں غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیابی کے مراحل سے گزارنے کے لیے صبر و ضبط ہر حال میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور دنیا کی ہر قوم نے اس صفت سے متصف ہو کر ہی اس دنیا میں فلاح و کامرانی حاصل کی ہے، مگر اسلام میں اس کی اہمیت اس بنا پر غیر معمولی ہے کہ یہاں ایک طرف تو منزلِ مقصود ایک غیر مرئی ذات کی رضا جوئی ہے اور دوسرے اس ذات کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو معیارات قائم کیے گئے ہیں وہ بھی ایسے نہیں کہ انہیں حواس کے پیمانوں سے ماپا جا سکے۔ ان کو وزن کرنے کے لیے ایک دوسری میزان اور ایک دوسرا مقوّم ہے اور وہ ان کا دینی نفع اور اُخروی اجر ہے۔ ایک مسلمان جب اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا ربّ اللہ ہے اور وہی بلا شرکتِ غیرے اس کا خالق، مالک اور فرمانروا ہے تو پھر اسے صادق القول ثابت ہونے کے لیے مختلف آزمائشوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی اس پر رزق کے دروازے کشادہ کر دیئے جاتے ہیں اور وہ اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ان مادی وسائل اور اسباب کو اپنا الٰہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کا امین ہے اور انہیں صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ہی خرچ کرتا ہے۔ کبھی اسے تنگی اور مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے عمل سے

یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیاوی مصائب اصل مقصد سے اسے باز نہیں رکھ سکتے بلکہ مقصد کے ساتھ وابستگی کو اور بڑھاتے ہیں۔ کبھی راستے کی مشکلات خود بخود اس پر کھول دی جاتی ہیں، مگر ایک مسلمان اسے اپنے تدبّر اور تفکّر کی کرشمہ سازی سمجھنے کے بجائے اسے فضلِ ایزدی سمجھتا ہے اور اگر کبھی مصلحتِ الٰہی اس کی راہ میں سنگِ گراں حائل کر دیتی ہے تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ تائیدِ ربّانی کے بھروسے پر اسے راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض مختلف طریقوں سے خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور خدا کے یہ فرمانبردار بندے اس کے فضل کے سہارے زندگی کی اُن پُر پیچ راہوں میں ثابت قدم رہ کر اپنی متاعِ ایمان کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ آزمائش ایمان کی ایک لازمی اور ضروری شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ (آل عمران ۱۷۹)

"اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔"

الٓمّٓ ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (عنکبوت ۱ تا ۳)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور ... جھوٹے کون۔"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (توبہ ۱۶)	"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جُہد کا حق ادا کیا۔ اور اللہ اور رسولؐ اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔"

یہ سب آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ ایک مسلمان جب اس دنیا کے مصائب و شدائد سے گزارا جاتا ہے تو اس عمل کا مقصد اسے مفلوج یا برباد کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی حقیقی غرض یہ ہوتی ہے کہ اسے نہ صرف ہر قسم کے کھوٹ اور آلائش سے پاک کر کے کندن بنا دیا جائے بلکہ اسے ایک ایسا موقع بھی فراہم کیا جائے جس میں وہ اپنے آپکو ایمان میں سچّا اور کھرا ثابت کر سکے۔

ایک شریر اور مفسد انسان کسی وقتی جذبے کے زیرِ اثر آ کر کبھی کبھار ایک نیک سے نیک کام سرانجام دے سکتا ہے اور اسی طرح ایک شریف سے شریف انسان کسی ہنگامی جوش کے تحت ایک بدترین فعل کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ لیکن ہم اس سے یہ نتیجہ کبھی اخذ نہیں کر سکتے کہ ان دونوں کی زندگیوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ بُرا آدمی اس لیے نیک نہیں کہلا سکتا کہ اس نے زندگی میں کوئی ایک آدھ اچھا کام کر دیا ہے اور ایک نیک آدمی کبھی اس بنا پر بُرا نہیں کہلا سکتا کہ اس سے نادانستہ طور پر ایک غلطی کا ارتکاب ہو گیا ہے۔ جب ہم کسی شخص کے نیک یا بد ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کا انحصار ایک آدھ فعل پر نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے اندازِ زلیست یا اسلوبِ حیات کو بحیثیت مجموعی دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ یہی چیز زندگی کا رُخ متعین کرتی ہے۔ زندگی میں افعال و اعمال اگرچہ بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم زندگی کی عام ڈگر ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ایک نیک کام سرانجام دے لینا نہایت سہل اور آسان ہے لیکن پوری زندگی کو پاکبازانہ گزارنا

بہت دشوار منزل ہے۔

پاکیزہ نظریۂ حیات

اصل چیز نیک عمل نہیں بلکہ نیک روش ہے۔
عمل تو اس روش کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔

لہٰذا نیک اور بد زندگی کے درمیان حدِ فاصل کسی ایک عمل کے ذریعہ نہیں کھینچی جا سکتی، بلکہ ان کے درمیان جو چیز نشانِ امتیاز ہے وہ صرف اندازِ زیست ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندازِ زیست مختلف اعمال کے مجموعہ سے عبارت ہے لیکن اس میں افعال و اعمال کے علاوہ کسی فرد یا قوم کا نظریہ بھی شامل ہوتا ہے۔ جس کی حیثیت سیمنٹ کی سی ہوتی ہے اور وہ انسان کے مختلف اعمال کو باہم ایک دوسرے سے پیوست کر کے سیرت و کردار کا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرتا ہے۔ فکر و عمل کے باہمی امتزاج سے اٹھائی ہوئی سیرت کی اس ٹھوس عمارت میں کسی ایک فعل یا عمل کے مقابلے میں زیادہ پائیداری اور مضبوطی پائی جاتی ہے۔ پھر ایسے تمام افعال جو کسی نظریۂ زندگی کے طفیل معرضِ وجود میں آئے ہوں، ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوتے ہیں اور اس طرح زندگی میں ایک فطری وحدت نمودار ہوتی ہے۔

جس فرد کی زندگی کے مختلف مظاہر میں ہم رنگی پائی جائے اس کے بارے میں سمجھ لیجئے کہ وہ ایک خاص طرزِ فکر کا حامل ہے یا سادہ الفاظ میں وہ اپنا ایک مقصد یا ایمان رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی زندگی کبھی مرغ بادنما نہیں بن سکتی جس کے رُخ کو مادی حوادث کے تند و تیز جھونکے ہر لمحہ بدلتے رہیں۔ اس کی حیات ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جو دنیا کے ہر رہرو کو منزلِ مقصود کا پتہ دیتا ہے۔

ایک زندہ و پائندہ خدا پر ایمان لانے والے سے بڑھ کر آخر کس شخص کی زندگی میں پائیداری اور استواری ہو سکتی ہے اور ایک مومن سے بڑھ کر کون شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی زندگی میں وحدت اور یکسانیت ہو۔ جو شخص اللہ پر ایمان لانے کا دعویدار ہے وہ درحقیقت

اپنے دل وجان سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ اس کی زندگی کی غایتِ اولیٰ اپنے مالک کی رضاجوئی ہے۔یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے وہ جیتا ہے، تگ ودَو کرتا ہے، مصائب برداشت کرتا ہے اور بالآخر اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اگرچہ زندگی کی مختلف منازل سے گزرتا ہے لیکن ان سب میں اس کے سامنے مقصد صرف یہی ایک رہتا ہے۔اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک مسلمان کے نزدیک دُکھ اور سُکھ، مسرت اور غم، کامیابی و ناکامی سب اعتباری باتیں ہیں۔ایک مسلمان اس وقت تک کامیاب ہے جب تک اسے اپنے مقصد کے ساتھ عشق اور وابستگی ہے اور وہ اس وقت ناکام ہے، جب اس کی منزلِ مقصود اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔اس بنا پر ایک مسلمان کی کامیابی اور ناکامی خارجی پیمانوں سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس کو معلوم کرنے کے لیے اس کے اپنے سینے ہی میں ایک پیمانہ لگا دیا گیا ہے جسے عام اصطلاح میں دل، قلب یا وجدان کہا جاتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ سلطنتوں کی سلطنتیں فتح کرتا چلا جائے، مگر اللہ کے نزدیک ان کے یہ سارے کارنامے اس وجہ سے بے وزن ہو کر رہ جائیں کہ ان کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق نہ تھا بلکہ کشور کشائی اور حصولِ اقتدار تھا اور اس کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت ایک انچ زمین بھی حاصل نہ کر سکے مگر وہ اللہ کے ہاں محبوب ہو کیونکہ اس کا مقصد اللہ کے دین کی سربلندی تھا اور اس کے لیے سعی کرنے کا حق اس نے ادا کر دیا۔یہاں اصل چیز مقصد اور اخلاص ہے۔ اور یہی دو چیزیں اندازِ زیست متعین کرتی ہیں۔

اس ضمن میں ایک چیز کی وضاحت نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ہم زندگی میں یکسانیت اور صبر و ثبات کا جو بار بار ذکر کر رہے ہیں تو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مسرت اور غم، فتح مندی اور ناکامی کے سارے جذبات اور احساسات سے ہمیں یکسر محروم کر کے ہمارے اندر یونانی فلاسفہ کی سی رواقی (Stoics) بے پروائی کو پروان

چڑھانا چاہتا ہے۔ اسلام کا مقصد ہمیں بے حس بنانا نہیں بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ کامرانی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یا ناکامی کی چوٹیں سہتے ہوئے بھی ہم اپنے خالق اور مالک کو بھولنے نہ پائیں۔ اگر ہم سے ہمارے جذبات و احساسات ہی سلب کر لیے جائیں تو پھر تو صبر کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اسلام ہم سے ہماری انسانیت اور آدمیت چھیننے نہیں آیا بلکہ ہمیں یہ سکھانے آیا ہے کہ ہم زندگی کی مختلف کیفیات سے گزرتے ہوئے اپنے خالق سے اپنا تعلق بہرصورت قائم رکھیں۔ قرآن پاک اور احادیثِ نبوی میں اکثر و بیشتر مقامات پر اس امر کی صراحت موجود ہے۔ مثال کے طور پر مصائب کے ہجوم میں گھر کر مضطرب اور پریشان ہونا بالکل فطری امر ہے اور اس سے انبیاء تک متاثر ہوئے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ

(البقرۃ ۲۱۴)

"پھر کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے۔ حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

یہ آیت اس امر کا صاف اظہار کر رہی ہے کہ حوصلہ شکن حالات میں پریشان ہو جانا بالکل ایک فطری چیز ہے۔ اسی طرح احادیث میں اس سب سے زیادہ ضبط اور صبر کرنے والی ذاتِ اقدس کے بارے میں موجود ہے کہ اس کی آنکھوں سے بھی کبھی کبھی غم انگیز

منظر دیکھ کر آنسو بہہ جایا کرتے تھے۔

وعن ابی زید اسامة بن زید بن حارثة مولیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلّم وحبه وابن حبّه رضی الله عنه قال ارسلت بنت النبی صلی الله علیه وسلّم ان ابنی قد احتضر فاشهدنا فارسل یقرئ السلام ویقول ان لله ما اخذ وله ما اعطی وکل شیء عنده باجل مسمی، فلتصبر ولتحتسب فارسلت الیه تقسم علیه لیاتینها فقام ومعه سعد بن عبادة ومعاذ بن جبل واُبی بن کعب وزید بن ثابت ورجال رضی الله عنهم فرفع الی رسول الله صلی الله علیه وسلم الصبی فاقعده فی حجره ونفسه تقعقع ففاضت عیناه فقال سعد یا رسول الله

"حضرت اُسامہ بن زید بن حارثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے محبوب اور محبوب کے بیٹے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا قریبِ مرگ ہے آپؐ تشریف لے آیئے۔ آپؐ نے سلام کہلا بھیجا اور فرمایا اللہ ہی کے لیے ہے جو اس نے لیا اور جو اس نے دیا۔ اور ہر چیز کا اس کے پاس ایک وقت مقرر ہے، صبر کرو اور اجر طلب کرو۔ انہوں نے پھر کہلا بھیجا کہ آپؐ جلدی تشریف لایئے۔ یہ سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور آپؐ کے ساتھ سعد بن عبادہؓ، معاذ بن جبلؓ، اُبیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت اور بہت سے لوگ تھے۔ آپؐ کے پاس بچہ اٹھا کر لایا گیا۔ آپؐ نے اسے گود میں لے لیا اور اس وقت وہ دم توڑ رہا تھا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت سعدؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ کیا؟ فرمایا یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے

ماھذا فقال ھذہ رحمۃ جعلہا اللہ تعالیٰ فی قلوب عبادہ ۔ بندوں کے دلوں میں رکھا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

قرآنِ پاک اور حدیثِ نبوی ؐ کی ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں صبر سے مراد جذبات و احساسات کی محرومی نہیں بلکہ اسلامی اصطلاح میں اس کے معنی پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔ اسلام ہمیں بے حس چٹان بنانا نہیں چاہتا بلکہ وہ ہمیں ایک صاحبِ دل انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہرگز نہیں کہ ہم اپنے پہلو میں دل کی جگہ پتھر باندھ لیں اور اپنی حس کو اس حد تک مُردہ کر لیں کہ مسرت و غم کی مختلف کیفیات ہم پر بالکل اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اسلام ہمارے سارے احساسات کو زندہ رکھنے کا سامان کرتا ہے۔ ہمارے قلب کو تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ بنانے کا آرزومند ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی ؐ میں جو دعائیں موجود ہیں اگر آپ انہیں اس نقطۂ نظر سے مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دینِ حق انسان کے جذبات اور احساسات کو کس خوبی سے جلا دیتا ہے۔ یہاں کسی تفصیل کا موقع نہیں۔ ہم یہاں صرف چند دعائیں درج کرتے ہیں جن سے اس چیز کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۔ (البقرہ - ۲۸۶)	"اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں اگر کوئی قصور ہو جائے، اُن پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تُو ہمارا مولیٰ ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر"۔
اللّٰھم انی اعوذ بک	"اے میرے اللہ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔

من العجز والكسل والجبن
والهرم والمغرم والماثم ومن
عذاب النار وفتنة النار
وفتنة القبر وعذاب القبر
وشر فتنة الغنا وشر فتنة
الفقر ومن شر فتنة المسيح
الدجال ومن فتنة المحيا
والممات ومن القسوة
والغفلة والعيلة والذلة
والمسكنة والكفر والفسوق
والشقاق والسمعة والرياء
ومن الصم والبكم والجنون
والجذام وسيء الاسقام
وضلع الدين ومن الهم
والحزن والبخل وغلبة
الرجال واعوذ بك من علم لا
ينفع ومن نفس لاتشبع
ومن دعوة لايستجاب لها

دوں ہمتی، اور سستی اور بزدلی اور بڑھاپے سے، قرض داری اور گناہ گاری سے، دوزخ کے عذاب اور آگ کے فتنے سے، قبر کے فتنے اور قبر کے عذاب سے، مال و زر اور محتاجی کے بدترین فتنوں سے، مسیح دجّال کے بُرے فتنے اور زندگی و موت کی آزمائشوں سے، سنگدلی اور غفلت اور تنگدستی اور ذلّت وخواری سے، کفر اور فسق سے اور جھگڑالو پن اور شہرت پسندی اور ریاکاری سے، بہرے اور گونگے ہونے سے، جنون اور جذام اور بُری بیماریوں سے، بارِ قرض اور فکر و غم سے، بخل اور لوگوں کے غلبہ سے، اور اس سے کہ ناکارہ عمر تک پہنچوں اور دنیا کے فتنہ سے اور اس علم سے جو نافع نہ ہو۔ اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دُعا سے جو قبول نہ ہو۔"

ان دعائیہ کلمات کا مطالعہ کیجئے اور دیکھیے کہ ان میں جذبات واحساسات کی کس قدر حرارت موجود ہے۔ کیا یہ واردات کسی ایسے دل کی پیداوار ہیں جو مر گیا ہو، یا یہ ایک ایسے قلب کی تخلیق ہیں جس میں زندگی کی صحت اور توانائی موجود ہے۔ احساس مہجوری جو ان کلمات

کی جان ہے کسی شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ عمل کا زبردست محرک ہے۔ اس کی بدولت انسان کا خدا کے ساتھ رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

صبر کے فوائد

آیئے اب ایک نگاہ ذرا اُن مراحل پر بھی ڈال لیں جہاں صبر ہی بہترین زادِ راہ ہے۔

ایک انسان جو دعوتِ حق کے پاک اور مقدس عزم کے ساتھ اٹھتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ حق جس پر اس کائنات کا سارا نظام چل رہا ہے اور جس کی گواہی دنیا کی ہر چیز دے رہی ہے، وہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ اجنبی چیز ہے۔ انسانوں کی اکثریت اس نام کو سن کر چڑتی ہے، اس سے ہراساں ہوتی ہے، اس کی آواز پر کان بند کر لیتی ہے۔ یہ چیز ایک داعی کے لیے بڑی ہی پریشان کن ہوتی ہے۔

پھر اس مخالفت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ معاملہ صرف تغافل اور بے حسی ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اسی حق کے خلاف جو درحقیقت ان کی اپنی ہی کھوئی ہوئی میراث ہوتی ہے، لوگ ایک محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ اسے دبانے کے لیے طرح طرح کے منصوبے تیار کیے جاتے ہیں، اس کو بلند کرنے والوں پر کبھی آرے چلائے جاتے ہیں، کبھی انہیں صلیب دی جاتی ہے، کبھی انہیں اپنے وطن سے نکالا جاتا ہے، کبھی انہیں قید و بند میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور کبھی انہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا ہے۔ الغرض اُن پر خدا کی زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے۔

ایک طرف نوعِ انسانی کے ہاتھوں ان کا یہ حشر ہوتا ہے اور دوسری طرف ذاتِ باری تعالیٰ ان کی آزمائش شروع کر دیتی ہے۔ وہ کچھ مدت انتظار کر کے دیکھتی ہے کہ کون اپنے دعوے میں پختہ اور قول میں سچا اور کھرا ہے۔ ان حالات میں جب ایک طرف

حق کی بے کسی، بے چارگی اور بے بسی سامنے موجود ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورشیں اور ہنگامہ آرائیاں ہجوم کر رہی ہوں، انسان کا گھبرا اٹھنا ایک فطری امر ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (الطور-۴۸)

"(اور اے رسولؐ) صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کر، تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (یونس-۱۰۹)

"اور صبر کر یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے۔ وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔"

فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود-۴۹)

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (روم-۶۰)

"صبر کر، یقیناً انجام کار پرہیزگاروں ہی کے حق میں ہے۔ پس صبر کر، بلاشبہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔"

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا (الدھر-۲۴)

"صبر کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر، اور ان (مخالفین میں سے) کسی گنہگار ناشکرے کا کہا نہ مان۔"

اس مضمون کو ایک حدیث میں ابوعبداللہ خباب بن الارت کی روایت سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن حضور سرور کائناتؐ ایک چادر سے ٹیک لگائے خانۂ کعبہ کے سایے میں تشریف فرما تھے کہ ہم نے عرض کی یا رسولؐ اللہ آپ ہمارے لیے مدد کیوں نہیں مانگتے؟ آپ ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا:

قد كان قبلكم يوخذ الرجل فيحفر له في

"اگلی امتوں میں یہ کچھ گزر چکا ہے کہ ایک آدمی پکڑ لیا جاتا، پھر اس کے لیے گڑھا کھودا جاتا،

الارض فیجعل فیہا ثم یؤتی بالمنشار فیوضع علی راسہ فیجعل نصفین و یمشط بامشاط الحدید مادون لحمہ و عظمہ ما یصدہ ذالک عن دینہ واللہ لیتمن اللہ ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاءُ الیٰ حضرموت لا یخاف الا اللہ والذئب علیٰ غنمہ ولکنکم تستعجلون

اور اسے گڑھے میں رکھ کر آرہ اس کے سر پر چلایا جاتا۔ یہاں تک کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے اور لوہے کی کنگھی آدمی کے سر پر پھیری جاتی۔ اور وہ ہڈی اور گوشت میں دھنستی ہوئی پار ہو جاتی۔ مگر یہ تکلیفات ان لوگوں کو راہِ حق سے نہ ہٹا سکیں۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اس کام کو یقیناً پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اللہ کے سوا کسی کا اسے خوف نہ ہوگا۔ ہاں بھیڑیے کا اس کو اپنی بکریوں کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے لیکن تم جلد بازی سے کام لیتے ہو۔"

صبر کے معنی صرف یہی نہیں کہ آدمی مصائب کو برداشت کرے اور بے قرار نہ ہو، بلکہ اس میں تسلیم و رضا کا عنصر بھی شامل ہے۔ ایک داعیٔ حق کا فرض ہے کہ اس دعوت کی راہ میں جو مصیبتیں اور مشکلات آئیں انہیں خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کرے اور یہ یقین رکھے کہ جب اللہ تعالیٰ مناسب سمجھے گا تو وہ ان تکلیفات کو خود بخود دُور کر دے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصائب کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ برداشت کیا اس کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے:

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (ص ۴۴)

"ہم نے بلاشبہ ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ تھا۔ وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا۔"

اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مطالبۂ خداوندی کا ذکر کیا تو انہوں نے حکمِ الٰہی پر پوری تسلیم و رضا کا اظہار کیا اور فرمایا:

یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (صافات - ۱۰۲)	"ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کر ڈالیے، خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔"

حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اسی تسلیم و رضا کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان - ۱۷)	"نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے اس کو برداشت کر۔ یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔"

مصائب کے پیش آنے پر تسلیم و رضا کے طرزِ عمل کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صبر کی یہی کیفیت تو درحقیقت ایمان باللہ کی جان ہے۔ یہی چیز ایک خدا پرست کو مادہ پرست سے ممیّز کرتی ہے۔ مادہ پرست انسان کے فکر کا رقاص چونکہ مادہ کے محور پر گھومتا ہے اس لیے وہ زندگی کے سارے مصائب کی علتِ غائی صرف مادی حالات کی ناموافقت کو قرار دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تکلیفات نے اگر اسے گھیر لیا ہے تو اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ حواس کی دنیا اور اس کے مال و اسباب کو اپنے لیے کارآمد بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ زندگی کے شدائد و مصائب میں ایک گہری حکمت و دانائی دیکھتا ہے۔ وہ ان سے عبرت پکڑتا ہے۔ اس کے نزدیک مسرت و غم، آرزوؤں کی کشمکش، انسانیت کی کامرانیاں اور مسرتیں، قوموں کے عروج و زوال مادی حوادث کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ یہ سب اللہ کی حکمتِ بالغہ

کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پیچھے ایک زبردست مدبّر کی تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان خارجی حوادث کے پسِ پردہ جھانک کر اس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے جس کے دراصل یہ سارے مظاہر ہیں اور پھر اپنے آپ کو بالکل رضا کارانہ طور پر اس حقیقت کے تابع کر دیتا ہے۔ یہی معراجِ انسانیت اور کمالِ آدمیت ہے۔ یہی چیز ایک مومن کے قلب کو طمانیت کے نور سے بھر دیتی ہے۔ اس کے ذہن کو آفاقیت، نگاہوں کو بلندی اور علم کو وسعت عطا کرتی ہے۔ یہی مقام ہے جس پر پہنچ کر ایک انسان مار کھا کر ہنستا ہے، گر گر سنبھلتا ہے اور مصائب کے ہجوم میں گھر کر بھی اپنے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ یہ اسی ایمان کا اعجاز تھا کہ عین اس حالت میں جب کہ ابوفکیہہ کو پیٹ پیٹ کر مختل الحواس کر دیا گیا تھا تو ان سے ایک گزرتے ہوئے گبریلے کے بارے میں استہزاءً کہا گیا کیا تیرا پروردگار یہی تو نہیں؟ تو انہوں نے بلا تامّل فرمایا:

" میرا اور تیرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

تحمل اور بُردباری

صبر کے معاملے میں ایک اور ضروری چیز تحمل اور بُردباری ہے۔ آدمی جب توسیعِ دعوت کا کام کرتا ہے تو اسے مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان میں ایک مختصر تعداد اُن سلیم الفطرت لوگوں کی ہوتی ہے جو حق کی آواز کو سُنتے ہی اس پر اس طرح لبیک کہتے ہیں گویا کہ وہ پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ ان کے معاملے میں تو ایک داعی کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی بلکہ وہ ہمیشہ السابقون الاوّلون ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تعداد میں ہمیشہ کم ہی رہے ہیں۔ ایک اچھی خاصی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی نیتیں خواہ نیک ہی کیوں نہ ہوں مگر ان کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات کے لاتعداد کانٹے چبھے ہوتے ہیں۔ ان کانٹوں کو نکالنا بڑی دیدہ ریزی، محنت اور حکمت چاہتا ہے، اس میں انتہائی صبر و ضبط اور ہمدردی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ اس راہ میں ایسے لوگوں سے بھی بالکل ناگزیر طور پر سامنا ہوتا ہے جو اپنے مزاج کے لحاظ سے بڑے ہٹ دھرم اور ضدی ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بسا اوقات ایسی نفرت انگیز حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں کہ اگر صبر و ضبط کی زبردست مشق نہ ہو تو آدمی جادۂ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ کمینہ خصلت لوگ نت نئی بیہودگیاں سوچتے ہیں اور ہر روز اوچھے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حق کے علمبرداروں پر حملہ کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے قصوروں کو معاف کر دیں اور ان کی بیہودگیوں کے مقابلے میں اخلاقی پامردی دکھلائیں۔ قرآنِ پاک کی کئی آیتوں میں صبر اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (النحل ۱۲۶-۱۲۷)

"اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر و برداشت کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ کر اور نہ انکی سازشوں سے دل گرفتہ ہو۔"

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۔ (حٰمٓ السجدہ: ۳۴-۳۵)

"بھلائی اور برائی برابر نہیں ہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو تو تم دیکھو گے کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی وہ قریبی دوست ہو جائے گا، مگر یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہوتا ہے۔"

اسی مضمون کی حدیثِ نبوی میں اس طرح صراحت کی گئی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلوان

لیس الشدید بالصرعة انما الشدید من یملک نفسه عند الغضب ۔ (صحیح مسلم)

"وہ نہیں ہے جو حریف کو میدان میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے"۔

ایک دوسری حدیث میں صبر کی ایک نہایت ہی جامع و مانع تعریف ملتی ہے اور اسے ایمانی اخلاق کی خشتِ اول قرار دیا گیا ہے:

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلث من اخلاق الایمان من اذا غضب لم یدخلہ غضبہ فی باطلٍ ومن اذا رضی لم یخرجہ رضاہ من حق ومن اذا قدر لم یتعاط مالیس لہ۔

"حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین باتیں ایمانی اخلاق میں سے ہیں۔ جب غصہ آئے تو انسان مغلوب الغضب ہو کر باطل کی سرحد میں نہ گھس جائے۔ جب کسی سے خوش ہو تو یہ خوشی اسے حق کی حدود سے نہ نکال لے جائے اور جب آدمی قدرت و اقتدار پائے تو وہ کام نہ کرنے لگے جس کا اسے حق نہیں ہے"۔

یہ وہ مقام ہے جس پر ایک مسلمان کے صبر اور توکّل کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ اپنے فکر و عمل سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اپنے خالق کے ساتھ اس کا تعلق ہنگامی اور عارضی نہیں بلکہ نہایت پختہ اور پائیدار ہے اور اسی مقامِ محمود کے حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بڑے زوردار الفاظ میں یہ بشارت دیتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ

"بے شک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے۔ ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور ان سے فرمایا جاتا ہے) کہ تم نہ خوفزدہ ہو اور نہ غمگین۔ اور اس جنت

الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ ۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۔
(حم السجدہ ۔ ۳۰ تا ۳۲)

کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم تمہارے اس دنیا کی عارضی زندگی میں بھی دوست ہیں اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں وہی کچھ موجود ہے جو تمہارے نفس چاہیں اور تمہارے لیے اس میں وہی ہے جو تم مانگتے ہو بخشش والے رحمت والے کی طرف سے میزبانی کے طور پر"۔

اللہ کے دین کی سربلندی کا کام پھولوں کی سیج نہیں جسے کوئی فرد یا گروہ کوئی تکلیف اٹھائے بغیر سر انجام دے سکے۔ جب کوئی شخص نیکی کا حکم دیتا ہے تو منکرات کے سارے ایوانوں میں دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سب مل کر حق کے خلاف یلغار کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص برائی سے روکتا ہے تو برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اسے اپنے خلاف ایک خوفناک چیلنج سمجھ کر اس کے مقابلے میں آکھڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے وقت مختلف قسم کے مصائب کا پیش آنا بالکل فطری امر ہے اور انہیں ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کرنا دینِ حق کا ایک اہم تقاضا ہے:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ
(لقمان ۔ ۱۷)

"نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک، اور جو مصیبت پیش آئے اس پر صبر کر یہ بڑے حوصلے کے کاموں میں سے ہے"۔

قرآن مجید نے راہِ خدا میں نکلنے والوں کے لیے اخلاص، توجہ الی اللہ، صبر و ثبات کی جو بار بار تلقین کی ہے اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے مگر اس کی دوسری وجہ انسانی فطرت کی ایک بہت ہی بڑی کمزوری کے بارے میں احساس دلانا ہے۔ انسان جب کوئی جدوجہد کرتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش موجزن ہوتی ہے

کہ اس کے ثمرات کو وہ جلد ہی اپنی جھولی میں ڈال لے مگر جب اسے صبر آزما اور مشکل کام میں بظاہر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ بسا اوقات کسی سستے نسخے کو آزما کر کامیابی سے ہمکنار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے صبری اسے ایسے کام کرنے پر اکساتی ہے جو اصل مقصد کے منافی ہوتے ہیں اور اس کے لیے نقصان دہ بھی۔ اسی لیے قرآن مجید نے صبر کی تلقین کے ساتھ جلد بازی سے روکا ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف ۳۵)

"پس صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور مخالفوں کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔"

مقاصد و ذرائع کا باہمی ربط

مقصد اور ذرائع کے باہمی تعلق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقدس مقاصد صرف مقدس ذرائع ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مقصد تو نیک ہو مگر حاصل اسے ناپاک ذرائع سے کیا جائے۔ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد للّٰہیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ذرائع ناپاک ہوں تو ممکن ہے کہ انسان دنیوی اعتبار سے بظاہر کامیاب ہوتا نظر آئے مگر دینی اعتبار سے ناکام ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی کامیابی کا دار و مدار ظاہری کامیابی پر نہیں بلکہ خلوصِ نیت، راست بازی اور اللہ کی رضا پر ہے۔ اگر اس نے کامیابی کی بے جا خواہش اور تمنا میں اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دیا تو وہ کامیاب ہونے کے باوجود ناکام و نامراد رہا۔ لیکن اگر اس نے اس جدوجہد میں حق و صداقت کا دامن نہ چھوڑا اور مشکلات و مصائب کے باوجود جادۂ مستقیم پر گامزن رہا تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہی ہے چاہے ظاہر بین آنکھوں کی نظر میں وہ ناکام ہو۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف مختلف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۃ

حٰم السجدہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

(حٰم السجدہ ۳۳)

اور اس سے زیادہ اچھی بات اور کس کی ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور خود نیک کرداری اختیار کی اور کہا میں اللہ کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے اچھی بات اس بندۂ خدا کی ہے جو ایمان و عمل کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اس کی طرف بلاتا ہے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور اس راہ میں جان کھپاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اس بات کی متقاضی ہے کہ داعی کے اپنے اعمال نیک ہوں اور وہ خود اپنے مالک و خالق کا فرمانبردار بندہ ہو کیونکہ اگر اس کی اپنی زندگی اطاعتِ الٰہی سے مزیّن نہ ہوگی تو اس کی دعوت الی الخیر میں کیا اثر ہوگا؟

مقصد کی رفعت کے ساتھ ذرائع کی پاکیزگی اسلام کا ایک ایسا تابناک اور امتیازی پہلو ہے جو ایک مسلمان کی جدوجہد کو اوّل سے لے کر آخر تک روحانیت کے نور سے منور کر دیتا ہے۔ یورپ کے حکماء نے اہلِ یورپ کو جو فلسفۂ اخلاق دیا ہے اس کی رُو سے مقصد اور ذرائع دو الگ الگ شعبے ہیں۔ انہیں مادی فلسفۂ حیات نے یہ تعلیم دی ہے کہ اصل چیز مقصد کا حصول ہے اور اسے جائز و ناجائز جس طریقے سے بھی حاصل کیا جا سکے، کر لینا چاہیئے۔ اس فلسفے کو پوری قوت کے ساتھ بہت سے مفکرین نے پیش کیا، جن میں مکیا ولی سرِ فہرست ہے۔ اس شخص نے باطل فلسفہ کا پرچار کر کے یورپ کے اخلاق کو جس طرح بگاڑا ہے اس کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس باطل پرست "فلارنساوی حکیم" کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ حیلہ بازی، موقع پرستی، مکر و فریب، سب کو سندِ جواز مل گئی ہے۔ جھوٹ اور سچ کو ایک ہی مقام پر لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے اور اس

فلسفے کی وجہ سے سیاست کے اندر غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی حرکات کا عام چلن ہوا ہے۔

اس معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ مقصد جس ذریعے سے حاصل ہوتا ہے، وہ ذریعہ خود اس مقصد کا ایک حصّہ ہے۔ اسلام نے اپنے مقدس مقصد تک پہنچنے کے لیے جو راستہ اور انداز تجویز کیا ہے وہ خود بھی اتنا ہی مقدس اور پاکیزہ ہے جتنی کہ خود منزل۔ کیونکہ اسلام کے پیشِ نظر بنیادی حقیقت یہی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ جس راہ سے، فکر و احساس کے جس جذبے اور جس حوصلے اور نیت اور عزم کے ساتھ کسی منزل کی طرف بڑھتا ہے ان سب کا منزل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسلام اس بات کو اصولاً غلط اور فطرت کے منافی سمجھتا ہے کہ کوئی فرد یا گروہ غیر اخلاقی حرکات کی مدد سے کوئی بلند اخلاقی اور روحانی مقصد حاصل کر سکے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کی صراحت فرمائی ہے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (الرّعد ۲۲)

"اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی خاطر صبر کیا اور نماز قائم کی اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہِ خدا میں) خرچ کیا اور جو برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔"

یہ آیت مقصد اور ذریعہ کے باہمی تعلق اور ان دونوں کی تقدیس پر نہایت واضح الفاظ میں روشنی ڈالتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے خدا کے مخلص بندے کی پہچان یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور اس راہ پر ثابت قدم رہ کر جدوجہد کرتا ہے۔ جو مصائب اسے پیش آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ اس مقدس جدوجہد کو کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کے لیے سب سے اہم فرض نماز ہے۔ نماز کے ذریعے ہی اپنے رب کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز انفاق فی سبیل اللہ

ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے دل سے طمع، حرص، لالچ، بخل اور دنیوی مال و متاع کی محبت کو نکال کر اس کے اندر اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اس عمل سے اسے راہِ خدا میں خلوصِ نیت کے ساتھ ایثار کرنے کی تربیت ملتی ہے اور اسی ضمن میں آخری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ایک مومن صادق برائی کو نیکی سے دفع کرتا ہے۔ برائی کا مٹانا ایک بھلائی کا کام ہے۔ خدا کا بندہ خیر و بھلائی کے کام کو خیر اور بھلائی کے جذبے ہی سے انجام دیتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس بھلائی کے کام کو برائی کے ساتھ انجام دے تو اس کے مقدس مشن کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس آیت کا آخری جملہ "ان کے لیے آخرت کا انجام ہے" بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں خواہ مومن کو کامیابی نصیب نہ ہو مگر آخرت کی کامیابی، جو درحقیقت اس کی جدوجہد کی غائتِ اولیٰ ہے، وہ اسے ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک مومن کا مطلوب و مقصود رضائے الٰہی ہے جو سچے اور گہرے ایمان و ایقان اور پاکیزہ اعمال ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس کے حصول کے لیے وہ آخر ناپسندیدہ ذرائع کس طرح استعمال کر سکتا ہے؟

ایک مسلمان کے لیے سیاسی جدوجہد، معاشی تگ و دَو، معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش اور علم کے حصول کے لیے محنت، کوئی ایک کام بھی منتہائے مقصود نہیں، بلکہ سارے کام رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس بنا پر ان سارے کاموں کو اسی احساسِ ذمہ داری اور خلوصِ نیت سے انجام دینا چاہیے جس طرح کہ ایک انسان دینی فریضے کو ادا کرتا ہے۔ سیاسی جدوجہد سے اس کا مقصد اپنی قوم یا اپنے ملک یا اپنے قبیلے یا خود اپنی ذات کی سربلندی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کے پیچھے اللہ کے دین کو سربلند اور غالب کرنے کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ اسی طرح معاشی جدوجہد سے اس کا مقصود اپنی ذات یا برادری کے لیے زیادہ سے زیادہ معاشی منافع سمیٹنے کے بجائے انہیں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سچی اور گہری آرزو ہونی چاہیے۔ اسی حقیقت کو قرآنِ مجید نے اپنے بلیغ انداز

میں یوں بیان فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ (الانعام ۱۶۲)

"کہہ دو کہ میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔"

یہ ہے نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ایک مومن کی زندگی کا مقصد اور اس کا صحیح طرزِ عمل۔ اس کی عبادت اور مذہبی اعمال اس کی زندگی اور اس کی موت سب کا منتہائے مقصود خدا کی خوشنودی ہونی چاہیئے۔ اس بنا پر وہ سارے ذرائع جن کی مدد سے ایک مسلمان اس مقصود کو حاصل کرتا ہے وہ بھی بندگیٔ رب میں شامل ہیں۔

حصولِ مقصد کے لیے مغرب کے غلط نظریات

مغرب میں مقصد اور ذریعہ کو الگ الگ سمجھنے کا جو غلط تصور رائج ہے اس کی بنیاد دین و دنیا کی وہ تفریق ہے، جس کی ابتداء کلیسا نے کی اور جسے بعد میں مغرب کے مادہ پرست مفکرین نے قوت بہم پہنچائی۔ مگر یہ مفکرین اپنے سارے علم و فضل کے دعوے کے باوجود اتنی سادہ سی حقیقت نہیں سمجھ سکے کہ جس نصب العین کو مقدس سمجھا جاتا ہے وہ خود دوسرے بہت سے مقاصد سے عبارت ہوتا ہے جن میں ذرائع بھی شامل ہوتے ہیں۔ فکری اور نظری اعتبار سے ممکن ہے ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق کی جا سکے، مگر عملی جدوجہد میں مقصد اور ذریعہ کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو لوگ اس طرح کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے لیے بہت سی الجھنیں پیدا کر لیتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کے لیے یوں تو کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر ہم صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

اسلام کی تمام عبادات پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ پانچوں فرائض ذرائع اور مقاصد دونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ہم زندگی کا اصل مقصد رضائے الٰہی کو قرار

دیتے ہیں تو یہی مذہبی فریضے اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مگر جب فرائض کی ادائیگی کو مقصدِ حیات ٹھہراتے ہیں تو جن وسائل سے ہم یہ فرائض سرانجام دیتے ہیں ان کی حیثیت ذرائع کی بن جاتی ہے۔ مثلاً حج رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ بھی ہے، مگر یہی فریضہ جب مقصد بنتا ہے تو مال و دولت ذریعہ بنتے ہیں۔ جن کی مدد سے اس فرض کو سرانجام دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سیاسی جدوجہد کی مختلف کڑیاں ایک نقطۂ نظر سے مقاصد اور دوسرے نقطۂ نظر سے ذرائع کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اللہ کے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو سیاست کی حیثیت ذریعہ کی ہوتی ہے۔ کیونکہ سیاسی قوت اس عظیم مقصد کی تکمیل کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ مگر دوسرے نقطۂ نگاہ سے جب اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لیے سیاسی جدوجہد کی جاتی ہے تو یہ فرض بذاتِ خود مقصد دکھائی دینے لگتا ہے اور انتخابات میں کامیابی کے لیے سعی و جہد یا رائے عامہ کو ہموار کرنے کی تگ و دَو، یہ سب کام ذرائع کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ غالباً اسی بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے بعض لوگ دینی جماعتوں کی سیاسی جدوجہد اور اس کی پوری نوعیت کو سمجھ نہیں سکتے اور ان جماعتوں کو سیاسی جماعتیں کہہ کر ان کے دینی مرتبہ و مقام کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام نے جب مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھی تو ہم آخر یہ جسارت کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ جن کاموں کو دنیا غیر مذہبی کام سمجھتی ہے ان کو اس نے مذہب کے تابع کر کے اور انہیں اخلاقی حدود کا پابند بنا کر، ان کے اندر روحانیت کا نور بھر کر حیاتِ انسانی کو ایک فطری وحدت عطا کی ہے۔ یہ وحدت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب زندگی کے تمام شعبوں میں ہر موڑ اور ہر قدم پر دینی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کیا جائے۔

فَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ "پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے لہٰذا

فَلَہٗ اَسْلِمُوْا ۔ (الحج ۳۴) اس کے تم فرمانبردار ہو"۔

راہِ حق میں مشکلات پر صبر

اوپر جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق زیادہ تر قلب و دماغ سے ہے۔ اس سلسلے میں عملی جدوجہد کے لیے ہم ایک بات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ ہے "تدبّر و حکمت"۔ دراصل معاشرے میں بہت ہی تھوڑے لوگ دُھن کے پکے اور اصولوں سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ صرف یہی لوگ نظامِ حیات کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ معاشرے کے اجزائے ترکیبی سے واقف حضرات ہی اس مختصر گروہ کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو معاشرے میں اگرچہ پانچ دس فیصدی سے زائد نہیں ہوتے لیکن وہ ہوتے ہیں اصول کے پکے۔ اور جس بات کو وہ حق سمجھتے ہیں اس کی طرف دل و جان سے لپکتے ہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بلکہ اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں انہیں بڑے صبر و استقامت سے برداشت کرتے ہیں۔ یہ لوگ سیرت و کردار کے لحاظ سے پختہ ہوتے ہیں اور معاشرے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جب ان سے گفتگو کی جاتی ہے تو وہ عامیانہ اور سوقیانہ انداز سے ہرگز بات نہیں کرتے بلکہ خلوصِ نیت کے ساتھ اصول سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے اندر حق کو سمجھنے اور اس کا ساتھ دینے کی طلبِ صادق موجود ہے۔ اور وہ ایک اعلیٰ اور ارفع نصب العین کی محبت سینوں میں پیدا کرکے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جب حق کی طرف آجاتے ہیں تو پھر باقی خاموش اکثریت مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس طرح حق اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

دسواں باب

عورت کا مقام

اسلام کے عظیم احسانات میں سے عورت کو جس قدر حصہ ملا ہے اس کی نظیر اس دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو طبقہ جتنا زیادہ مظلوم تھا باری تعالیٰ نے اسے مظلومیت سے نجات دلانے کا اتنا ہی زیادہ التزام فرمایا۔

بعثت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عورت کی حیثیت

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں تشریف آوری سے پہلے عورت کی حیثیت محض ایک کھلونے یا سامانِ عیش سے زیادہ نہ تھی۔ وہ بے جان اشیاء کی طرح ایک مرد سے دوسرے مرد کی تحویل میں چلی جاتی اور کسی فرد کی وفات کے بعد اس کے وارث کے پاس دوسرے اثاثے کی طرح منتقل ہو جاتی تھی۔ لڑکی خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکہ تصور کی جاتی تھی اور ظالم والدین اسے ایک ناروا بوجھ سمجھ کر زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اس کے متعلق لوگوں کے اندر یہ بات مشہور تھی کہ اس کا خمیر گناہ سے اٹھایا گیا ہے اور اسی وجہ سے اس نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوا دیا تھا۔ ایک مرد جتنی عورتوں کو چاہتا اپنے حرم میں بلا تکلف لے آتا۔ نکاح محض ایک رسم تھی جس میں نہ تو کوئی تقدیس تھی اور نہ کسی ذمہ داری کا تصور وابستہ تھا۔ آپ اگر

رابرٹس سمتھ کی کتاب رشتہ اور نکاح قبل از اسلام کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ صنفِ نازک کس قسم کے ظلم و ستم اور استبداد کا شکار تھی۔ ایک عورت کو بیک وقت کئی کئی مردوں کی بیوی بن کر رہنا پڑتا تھا۔ اور بسا اوقات پورے خاندان کے مرد اسے اپنی ہوسناکی کا نشانہ بناتے تھے۔ اس مظلومہ کا کام صرف اسی قدر تھا کہ وہ مرد کی تفریح کا سامان پیدا کرے۔

رسمِ دختر کشی

مشہور مفسر زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں سورۃ التکویر کی ایک آیت کی تشریح کرتے ہوئے وہ طریقہ بیان کیا ہے جس کے مطابق بچیاں موت کے گھاٹ اتاری جاتی تھیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"جب بچی کی عمر چھ برس کی ہو جاتی تو خاوند، بیوی سے کہتا کہ اسے خوشبو لگاؤ اور زیور سے آراستہ کرو۔ پھر یہ خاوند اس بے بس بچی کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں ملاقات کے لیے لے جاتا۔ اور آخر جنگل کا رُخ کرتا۔ وہاں ایک گڑھا کھودتا اور اس بدنصیب کو اس کے کنارے کھڑے ہونے کا حکم دیتا۔ اور اس سے کہتا کہ تم اس گڑھے کی طرف غور سے دیکھو۔ اس حالت میں اسے پیچھے سے دھکا دے کر اس گڑھے میں گرا دیتا اور اس کے اوپر مٹی ڈال کر اسے زمین کے ساتھ ہموار کر دیتا۔"

جب ایک عورت کسی خاندان میں چلی جاتی تو اس کی آزادی یکسر سلب ہو جاتی۔ وہ اس خاندان کی ملکیت تصور ہوتی۔ اسے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے ملنے کی قطعاً اجازت نہ ہوتی اور وہ بالکل ایک بے جان مخلوق کی طرح بڑے عذاب میں زندگی بسر کرتی۔ "کامل المبرّد" میں بنی عامر کی ایک عورت کا نوحہ درج ہے جو اس نے اپنے نکاح پر پڑھا۔ اس سے عورت کی بے بسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"بہن کو اپنے بھائی کی مدح و ستائش سے گریز کرنا چاہیئے۔ اب بیٹی کو باپ کی

موت پر ماتم کرنے سے بھی باز رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اب وہ ایک ایسی جگہ منتقل ہو گئی ہے جہاں اس کی آزادی مسلوب ہے۔ اس کے لواحقین نے اسے دنیا کے ایسے دُور دراز گوشے میں بھیج دیا جہاں وہ اپنے کسی عزیز سے مل نہیں سکتی۔"

ابنِ جریر نے اپنی مشہور تفسیر طبری میں وہ طریقہ بیان کیا ہے جس کے تحت عورت اپنے خاوند کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوتی۔ بیوہ کے حقوقِ مالکانہ حاصل کرنے کے لیے اس پر ایک چادر ڈال دی جاتی۔ یہ اس بات کی علامت بھی کہ اب یہ عورت چادر ڈالنے والے کے قبضے میں آچکی ہے۔ اگر یہ آفت زدہ مخلوق خوب صورت ہوتی تو وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتا ورنہ وہ اسے کسی دوسرے کے ہاتھ بڑی بے تکلفی کیساتھ فروخت کر دیتا۔

عورت کو جب ذی روح مخلوق تسلیم ہی نہ کیا جاتا تھا اور جب وہ انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھی جاتی تھی تو اس کے احترام اور اس کے حقوق کا سوال آخر کس طرح پیدا ہو سکتا تھا۔ وراثت میں حصہ تو خیر بڑی چیز ہے اس کا اس کائنات ہی میں کوئی حصہ نہ تھا۔ وہ شیطان کی اولاد خیال کی جاتی تھی جس کے ذمہ صرف یہی کام تھا کہ کسی طرح مرد کے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنے۔

عورت پر اسلام کے احسانات

اسلام نے اس مظلوم طبقے پر اس قدر احسانات کیے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے تو اس نے اس بات کی سختی سے تردید کی کہ اس کا تعلق شیطان سے ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ عورت بھی اسی طرح ذی روح اور قابلِ احترام مخلوق ہے جس طرح کہ مرد، کیونکہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں ہیں۔ دونوں پر اپنے اپنے اعمال کی الگ الگ ذمہ داری ہے اور کسی ایک کو دوسرے کے افعال و اعمال کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ (النساء۔ آیت ۳۲)

اسی طرح اسلام نے میراث میں لڑکی کو اپنے بھائی کا حصہ دار بنایا اور خاوند کی وفات کے بعد اس کے ترکے میں سے اسے ایک مستقل حصے کا وارث قرار دیا۔ ماں باپ پر اس کی پرورش کی ذمہ داریاں عاید کیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی انہیں تاکید کی۔ والدین سے رخصت ہونے کے بعد جب وہ رشتۂ مناکحت کے تحت اپنے خاوند کے گھر میں منتقل ہوئی تو وہاں بھی اس کے مستقل حقوق کا تعین کیا گیا۔ مرد پر اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری ڈالی گئی اور مرد کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ اس کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا برتاؤ کرے۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے وقت اس کی رضامندی کو ضروری سمجھا گیا۔ اگر وہ اپنے خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی تو خلع کے ذریعے علیحدگی اختیار کرنے کا حق دیا گیا۔ اسلام نے عورت پر جس قدر احسانات کیے ان کا ایک غیر مسلم خاتون نے یوں اعتراف کیا ہے:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پیشتر عورت معاشرے میں نہایت ذلیل شے تصور کی جاتی تھی۔ اس کی حیثیت بے جان اشیاء کی سی تھی اور یہ سب کچھ یہودی راہبوں کی تعلیم کا اثر اور نتیجہ تھا۔ ذلت وخواری اس کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ گھر کے دوسرے سامان کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی اور مرنے والے کے ورثاء جس طرح چاہتے اس سے فائدہ اٹھاتے۔ اس کی محافظت اور نگہبانی کا کوئی انتظام نہ تھا، کوئی قانون ایسا نہ تھا جو اسے پناہ دیتا۔ ترکہ میں اس کے لیے کوئی حصہ نہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورت کی یہ مظلومیت کسی طرح گوارا نہ تھی، انہوں نے اس بے بس مخلوق کو ذلت کے مقام سے اٹھا کر مردوں کے دوش بدوش عزت واحترام کے مقام پر کھڑا کیا اور مرد اور عورت کے درمیان مساوات کی تعلیم دی۔ انہوں نے مردوں کے حرم میں عورتوں کے بے قید داخلہ پر پابندی لگائی۔ انہوں نے بچیوں کو

زندہ دفن کرنے کی رسم کا یکسر خاتمہ کیا۔ انہوں نے رشتۂ نکاح کو تقدس دیا۔ عورت کو وراثت اور خلع کے حقوق عطا فرمائے۔ مرد پر عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داریاں عاید کیں۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں، بے نواؤں اور بیواؤں کی پرورش کرنے والوں اور ان کی معاونت اور دستگیری کرنے والوں کو خدا کے ہاں اجرِ عظیم کا مستحق ٹھہرایا۔ حضورؐ نے تہذیب کے ارتقاء اور ترقی میں عورتوں کی خدمات کو پوری طرح تسلیم کیا اور اس بناء پر ان کی روحانی اور اخلاقی نشو ونما کو نظامِ اسلامی میں بہت زیادہ اہمیت دی۔

اس دَور میں جب حضورؐ دنیا میں تشریف لائے دنیا کے تمدن میں یہ غیر معمولی انقلاب تھا۔ اور اس سے جو تبدیلیاں ہوئیں انہیں کسی دَور میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔[1]

یہ تبدیلیاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے محض قانونی تبدیلیاں ہیں۔ عورت کے بارے میں اسلام نے فکر ونگاہ کو جس طرح بدلا ہے وہ خود ایک مستقل موضوع ہے جو بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ ہم یہاں صرف اس کے ایک دو پہلو پیش کرتے ہیں۔

قرآنِ پاک کی سورۃ النساء میں خصوصیت سے عورتوں اور یتیموں ہی کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں باری تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھائی ہے کہ وہ ان کی تمام کارروائیوں کو جاننے والا، دیکھنے والا اور ان کی نگرانی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ صفت جتنی مرتبہ یہاں دہرائی ہے غالباً کسی اور جگہ نہیں دہرائی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گھریلو معاملات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ سارے قانونی پابندیوں

---

[1] مس فلوری "مسلم ورلڈ" نیویارک جنوری ۱۹۲۰ء۔

کی گرفت میں آسکیں۔ خصوصاً خاوند اور بیوی کا رشتہ تو ایسا ہے کہ قانونی پابندی اسے سنوار نہیں سکتی۔ لہٰذا ان تعلقات میں خدا کا خوف ہی ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہنا چاہیئے اور دونوں فریقوں کو یہ حقیقت پوری طرح ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ وہ اگرچہ قانون کی گرفت سے تو بچ سکتے ہیں یا ایک فریق دوسرے فریق پر کسی قانونی حیلہ کے ذریعے زیادتی تو کر سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے جو علیم و خبیر ہے اس کا یہ فعل کسی طرح چھپا نہ رہ سکے گا۔ اسلام نے رشتۂ مناکحت کو نہ صرف مقدس بنایا ہے بلکہ اس نے قادرِ مطلق کو اس پر گواہ بھی ٹھہرایا ہے۔

عورت باعثِ تسکینِ حیات

پھر اسلام میں عورت کے وجود کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی رُو سے عورت نہ تو کھلونا ہے نہ مرد کے لیے سامانِ عیش بلکہ وہ ایک ایسی ذات ہے جس کا مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں مرد کے لیے وجہِ سکون و قرار ہو۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا پھر سورۂ روم میں ارشاد ہے وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

ان آیات سے تین باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ عورتیں ترکیبِ حیات میں مردوں کی مثل ہی ہیں یعنی انہی جیسی خواہشات، جذبات اور احساسات رکھنے والی مخلوق ہیں۔ دوم یہ کہ ان کی غائیتِ آفرینش یہ ہے کہ وہ مردوں کے لیے سرمایۂ راحت و تسکین اور باعثِ سکونِ خاطر ہوں۔ سوم یہ کہ مرد اور عورت کے تعلقات کی بنیاد باہمی محبت، اخلاص اور ہمدردی پر ہونی چاہیئے۔ قرآن مجید نے عورت کو شیطان کی اولاد، چڑیل، مرد کو گناہ کی ترغیب دینے والی یا اس کی کنیز نہیں ٹھہرایا بلکہ اسے اس کی انیس اور رفیق قرار دیا ہے۔

مغربی عورت کی موہوم ترقی

قرآن نے عورت کے وجود کا جو مقصد بیان کیا ہے اسے اگر نگاہ میں رکھ کر

جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت جدید مغربی تہذیب میں آج بھی اسی طرح مظلوم ہے جس طرح کہ آج سے چودہ سو برس پہلے مظلوم تھی۔ مغربی عورت کو اپنی ترقی اور آزادی پر بڑا ناز ہے لیکن یہ ترقی محض فریب نظر ہے۔ مرد آج بھی اسے اپنی ہوسناکی کا ذریعہ بنا رہا ہے، اسے اپنے عشرت کدے کی زینت کا سامان سمجھتا ہے اور اسے محض اپنی جنسی بھوک مٹانے کا آلہ خیال کرتا ہے اور پھر مزید ظلم یہ ڈھاتا ہے کہ اس معاملے میں اپنے آپ پر کوئی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یورپ میں عورت کے ساتھ آج جو انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہاں مشہور مغربی خاتون "اینی بیسنٹ" کے احساسات پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

"مغرب میں اگرچہ یک زوجگی کے چرچے ہیں لیکن وہاں دراصل تعددِ ازواج کی گرم بازاری ہے۔ ایک ایسی رسم جس میں مرد پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔ جب مرد کا دل ایک عورت سے سیر ہو چکتا ہے تو وہ اسے دھتکار دیتا ہے اور وہ بےچاری بازاری عورت بن جاتی ہے۔ مرد اس سلسلے میں کسی ضابطے کا پابند نہیں۔ اس مظلوم عورت کی حالت ان گھرانوں سے ہزار گنا بدتر ہوتی ہے جہاں مرد کے عقدِ نکاح میں ایک سے زائد بیویاں ہوں۔ تعددِ ازواج کی صورت میں کم از کم مرد اس کی محافظت اور کفالت تو کرتا ہے۔ جب ہم مغربی شہروں میں ہزاروں بے سہارا عورتوں کو رات کے وقت بے یار و مددگار سرگرداں دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مغرب کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تعددِ ازواج کی وجہ سے اسلام کے خلاف زبان طعن دراز کرے۔ کیا عورت کے لیے یہ بات بدرجہا بہتر اور باعثِ راحت نہیں کہ وہ سوکنوں کے ساتھ مل کر ایک مرد سے وابستہ رہے۔ اس کی آغوش میں جائز اولاد ہو اور معاشرے میں وہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے۔

اور اس طرح اس ظلم سے محفوظ رہے جس کے تحت وہ فریب کا شکار ہوکر گلیوں اور بازاروں میں ماری ماری پھرتی، ناجائز اولاد کو جنم دیتی اور بے سہارا اور بے بس ہوکر زندگی بسر کرتی ہے اور جس کا کوئی پُرسان حال نہیں ہوتا اور ہر وقت کسی مرد کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہے۔ ماں کا مقدس مقام حاصل کرنے کی اس میں سرے سے صلاحیت ہی ناپید ہو جاتی ہے اور ہر جگہ اس کے خلاف نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔"[1]

اسلام میں عورت کا معاشرتی مقام

اسلام نے عورت کو ذی مرتبت سمجھ کر نسلِ انسانی کی تربیت کی اہم ذمہ داری اسے سونپی ہے۔ نسلِ انسانی عورت کی گود ہی میں پروان چڑھتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اسلام عورت کو "شمعِ انجمن" بنانے کے بجائے چراغِ خانہ بنانا چاہتا ہے۔ انسان کی اخلاقی تربیت کا سب سے اہم اور پہلا فطری مکتب گھر کا ماحول ہے۔ اور عورتوں کو انسان کی تربیت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو مخاطب کرکے مسلمان خواتین کو یہ حکم دیا گیا ہے۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

" اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور جاہلیت قدیم کے مطابق اپنے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔ نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کے احکام بجالاؤ۔ اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ اے (نبی ؐ کے) گھر والو تم کو آلودگی سے دُور رکھے اور تمہیں

---

[1] COMMISSION REPORT MARRIAGE- از پروفیسر خورشید احمد

تَطْهِيراً - وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيفاً خَبِيراً -

الاحزاب ۳۳-۳۴

پوری طرح پاکیزہ رکھے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں انہیں یاد کرتی رہا کرو۔ بے شک اللہ بڑا باریک بین اور پورا خبردار ہے۔"

ان آیات سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اس بات کی بھی ہدایت کی ہے کہ تم غیر محرم مردوں کے ساتھ گفتگو میں لوچ اور نزاکت پیدا نہ کرو، کیونکہ اس میں اس بات کا خدشہ موجود ہے کہ ایک آدمی جس کی نیت میں فتور اور جس کے مزاج میں فساد ہو، وہ آپ کے نرم لب ولہجہ اور اس کی رعنائی اور دلفریبی سے متاثر ہو کر اپنے دل میں کوئی غلط خیال نہ بٹھالے۔ اس حکم کی جو اہمیت اُس وقت کی سوسائٹی میں تھی، وہی اہمیت عام مسلمان عورتوں کے لیے آج کی غیر صالح، فاسقانہ اور فاجرانہ فضا میں بھی ہے۔ فقہاء نے اس حکم پر قیاس کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ عورتیں تو ایک طرف رہیں، خود مردوں کو بھی ایسی باتیں کرنے سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے، جن سے سفلی جذبات برانگیختہ ہونے کا امکان ہو۔ ابنِ جصاص نے احکام القرآن میں ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ عورت کے لیے اتنی بلند آواز میں گفتگو کرنا جائز نہیں جسے غیر محرم سن سکیں۔

اختلاط مرد و زن کے اس رجحان کی پوری طرح ممانعت کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ حکم صادر فرمایا ہے جس کی طرف محولہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ تم گھروں کے اندر سکون اور قرار سے رہو اور اپنی زیب و زینت لوگوں کو نہ دکھاتی پھرو۔ لفظ قَرْنَ کو بعض مفسرین نے "وقار" سے مشتق قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابنِ جصاص احکام القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ای کن اھل وقار وھدوء وسکینۃ

"یعنی تم گھروں میں طمانیت قلب کے ساتھ پُر وقار طریق سے رہو"۔

قرآن مجید نے نہ صرف عورتوں کو یہ شریفانہ اور معقول طرزِ عمل اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے بلکہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ کا حکم صادر فرما کر ایسا فاسقانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی بڑی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے جس کے تحت صنفِ نازک میں اپنے حسن اور اپنی آرائش و زیبائش سے مردوں کی نظروں کو مفتوح کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ بن سنور کر گھروں کی محفوظ چار دیواری سے باہر نکل کھڑی ہوتی ہیں۔

گھر کی چار دیواری یا عورتوں کی ملازمت

عورت ایک ایسی بلند ہستی ہے جو اسلامی معاشرے کی بنیادوں کی حفاظت اور پاسبانی کرتی ہے وہ معاشرہ کی ذمہ دار رکن ہے وہ اسلامی اخلاق کی ترویج و اشاعت میں سب سے زیادہ فعال کارکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان اہم ذمہ داریوں کی بجا آوری عورت اسی صورت میں کر سکتی ہے جب وہ دلجمعی کے ساتھ گھر بیٹھ کر اولاد کی تربیت پر پوری توجہ صرف کرے۔ اسی بنا پر اسلام نے اسے گھر سے باہر کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ یہ ایک بہترین تقسیم کار ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ شدید ناانصافی ہے کہ عورتیں گھر کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوں، اپنا خصوصی وظیفۂ حیات بھی ادا کریں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے مردوں کے دوش بدوش دفتروں، کارخانوں، ہوٹلوں اور صنعت و تجارت کے دوسرے اداروں میں کام بھی کریں۔ اسلام نے عورت پر گھر کے سکون، آرام اور گھر کی فضا کو اخلاق و شرافت کا نمونہ بنانے کی ذمہ داری عاید کی ہے۔ اس نے عورت اور اس کے بچوں کی کفالت کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے۔ فطرت نے جس طرح مرد اور عورت کی جسمانی ساخت میں فرق رکھا ہے اسی طرح ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کو بھی الگ الگ رکھا ہے۔

گیارہواں باب

انسان کا قتلِ ناحق

ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جس سرعت کے ساتھ اخلاقی انحطاط آ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں جس افسوسناک انداز سے انسانی جان اور عزت و آبرو کا احترام رخصت ہو رہا ہے۔ وہ ہر اس شخص کے لیے انتہائی پریشان کن ہے، جس کے اندر انسانیت کی کوئی معمولی رمق بھی باقی ہے، کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو قتل و غارت کے متعدد واقعات ملیں گے اور انہیں پڑھنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس سفاکی کے پیچھے کوئی زبردست وجوہِ اشتعال کام نہیں کر رہے بلکہ نہایت معمولی معمولی باتوں پر بڑی شقاوتِ قلبی کے ساتھ قیمتی جانوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے یوں نظر آتا ہے کہ انسانوں کی بستیاں آدمیت سے خالی ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ درندگی کا راج قائم ہو رہا ہے۔ اسی سلسلہ میں آپ ہر قسم کے گروہی اور سیاسی اختلافات سے بلند ہو کر ذرا اس ہولناکی کو بھی نگاہ میں لائیں جس کا مظاہرہ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے۔

عام قتل کی وجوہات

انسانی خون کی یہ ارزانی کسی ہنگامی اور وقتی صورتِ حال کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے

پیچھے کچھ ایسے عوامل کارفرما ہیں جن پر انسانیت کے تمام بہی خواہوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا گیا تو انسان بڑی سُرعت کے ساتھ تباہی کے راستے پر بڑھتا چلا جائے گا اور چند سالوں میں اس کا انحطاط اس مقام پر پہنچ جائے گا جہاں سے اسے سنبھالا دینا قریب قریب ناممکن ہوگا۔ جو ملک غیر ملکی حملوں اور دشمنوں کی بم باری سے تباہ ہوتا ہے وہ جلد ہی از سرِ نو تعمیر ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اس کے اندر بسنے والوں کے حوصلے پست نہ ہوں اور ان میں زندہ رہنے کا جذبہ مضمحل نہ ہو چکا ہو۔ لیکن جس ملک میں انسانیت کا دیوالہ نکل جائے، جہاں ظلم و ستم اور بدمعاشی کا دَور دَورہ ہو، جہاں ایک بھائی ہی خود اپنے دوسرے بھائی کے دَرپئے آزار ہو اور کوئی فرد بھی اپنی جان اور عزت و آبرو کو محفوظ محسوس نہ کرتا ہو اس ملک کو قدرتی وسائل و ذرائع کی فراوانیاں اور وسیع منصوبہ بندیاں تباہی سے کسی طرح بچا سکتی ہیں۔

کسی ملک کی بقاء اس کے استحکام اور اس کی ترقی کا سارا دارومدار انسانی آبادی پر ہے۔ انسان کے لیے خوراک، لباس اور دوسری ضروریاتِ زندگی سے کہیں زیادہ اہم زندگی کے تحفظ کے متعلق اطمینان ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کا اپنی زندگی کی حفاظت کے متعلق اطمینان پانی اور ہوا سے بھی زیادہ ضروری ہے، تو یہ زیادہ صحیح ہوگا کیونکہ وہ ہوا، پانی اور زندگی کی دوسری ضروریات حاصل کرنے کی صرف اسی صورت میں خواہش اور کوشش کرے گا کہ جب وہ جینے کے حق سے محروم نہ ہوگا۔ زندہ رہنے کا یہی بھروسہ اس کے اندر جدوجہد کی امنگ پیدا کرتا ہے اور وہ خداداد صلاحیتوں کو ایک خاص نہج اور راستے پر ڈالتا ہے۔ جس شخص کے سر پر ہر وقت ستم کی تلوار لٹکتی رہے اور جسے ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں اور جو اپنی زندگی کو ہر آن ظالموں کی دست درازیوں کی زد میں سمجھتا رہے، اس کی فکری اور ذہنی صلاحیتیں کسی طرح اُجاگر نہیں ہو سکتیں۔ مسلسل خوف و ہراس کی کیفیات سے نہ صرف جذبات میں اور دل میں بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔

بلکہ انسان کی ساری قوتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں خصوصاً جب اس خوف اور عدمِ اطمینان کے سامان ان اطراف سے پیدا ہونے شروع ہو جائیں، جنہیں وہ اپنی حفاظت کے زبردست مورچے سمجھتا ہو۔

جو حضرات اس نیم برِاعظم کے گزشتہ چالیس پچاس سال کے حالات پر کچھ بھی نگاہ رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انگریز نے اپنی ساری خامیوں، کمزوریوں اور خود غرضیوں کے باوجود یہاں امن وامان قائم کر رکھا تھا۔ اس نے بلاشبہ ملک کو سیاسی لحاظ سے کچلا اور معاشی اعتبار سے تاخت وتاراج کیا۔ اس نے معاشرے میں سے بے ضمیر اور خود غرض لوگوں کو بڑی محنت سے تلاش کیا اور پھر انہیں اپنے بھائیوں کا گلا دبانے کے لیے بڑے شرمناک طریقے سے استعمال کیا۔ اس نے دین اور اخلاق کی بیخ کنی کیلئے ہر انسانیت سوز حربہ استعمال کیا۔ لیکن ان سب تلخ حقائق کو ماننے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس نے ملک کے انتظام وانصرام میں بڑی دل چسپی لی اور لوگوں کی جان ومال کی حفاظت کے لیے خاطر خواہ انتظامات کیے۔ چنانچہ اگر آج چالیس برس پہلے کے ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں آپ کو قتل وغارت کے بہت کم واقعات ملیں گے۔

پھر اگر کبھی اس قسم کے چند واقعات ہو بھی جاتے تھے تو ان کی بڑی تندہی سے تفتیش ہوتی تھی۔ مجرم اکثر وبیشتر گرفتار کر لیے جاتے اور انہیں اپنے جرائم کی قرار واقعی سزا ملتی۔ جس سے مجرموں کے حوصلے پست ہو جاتے اور وہ آج کی طرح بے خوف ہو کر انسانوں کے جان ومال اور عزت وآبرو پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہ کر سکتے تھے۔

ملکی نظم ونسق میں کمزوری

انگریز کے رخصت ہونے سے چند سال پیشتر ہی ملک کا نظم ونسق کافی حد تک ڈھیلا پڑ گیا اور اس وجہ سے سماج دشمن عناصر کے حوصلے بڑھنے لگے اور انہوں نے لوگوں کو مختلف طریقوں سے ستانا شروع کیا۔

ایک طرف تو ان ناپسندیدہ عناصر کی سرگرمیاں تیزی سے بڑھتی رہیں اور دوسری طرف مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں اختلافات کی ایک ایسی خلیج حائل ہوتی رہی جس نے بالآخر ایک دوسرے کے خلاف شدید منافرت کی صورت اختیار کرلی۔ غنڈوں نے جذبات کی اس تلخی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی قوم کے ہیرو بن کر دوسری قوم کے افراد کا گلا کاٹنے میں مختلف جتھوں کی رہنمائی کی۔

پاک و ہند کی تاریخ میں اس دَور سے زیادہ کوئی تاریک دَور نہیں ملتا جب ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں نے خونخوار لوگوں کی سرکردگی میں اَن گنت بے گناہ اور بے کس انسانوں کا قتلِ عام کیا۔ امن پسند شہریوں کی جائدادیں لوٹیں اور جلائیں۔ معصوم اور بے کس عورتوں کی عصمت دری کی اور چھوٹے چھوٹے بچوں تک کو بڑے دردناک طریقے سے وحشت و بربریت کا نشانہ بنایا۔ جن لوگوں نے وہ روح فرسا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور وہ اپنے پہلو میں پتھر نہیں دل رکھتے ہیں ان کے جسم پر آج بھی اِن حالات کے تصوّر سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

تقسیم سے پہلے کلکتہ، بہار اور دوسرے مقامات پر اور پھر تقسیم کے وقت برعظیم کے مختلف علاقوں میں انسان نے انسان کا جو حشر کیا اس سے نہ صرف انسانی اقدار کی مٹی پلید ہوئی بلکہ خود انسانی جان کا احترام بالکل ختم ہوکر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنگلوں اور ویرانوں میں وحشی جانور اور درندے تو ایک دوسرے کو گوارا کر رہے ہیں، لیکن انسان ایک دوسرے کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا بن چکا ہے اور وہ بالکل معمولی انگیخت پر اس کی زندگی کا چراغ گُل کرنے پر تل جاتا ہے۔

ملک آزاد ہونے کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ کار آئی ان کا یہ فرض تھا کہ انسان کے منہ کو انسانی خون کی جو چاٹ لگ گئی ہے اس کی کوئی فکر کی جاتی لیکن تقسیمِ ملک نے اس قسم کے پیچیدہ مسائل اور الجھنیں پیدا کر رکھی تھیں انہوں نے بعض فرض

شناس اصحابِ اقتدار کو بھی اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اور آدم خور انسان بڑے مزے اور اطمینان کے ساتھ انسانی خون سے لذت حاصل کرتے رہے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد رفتہ رفتہ عنانِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی، جو عوامی تائید و حمایت سے یکسر محروم تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے ناجائز اقتدار کی حفاظت کے لیے جہاں حکومت کی انتظامی مشینری کو بے دریغ استعمال کیا وہاں غنڈوں کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ رجحان اگرچہ تقسیم ملک سے پہلے ہی کسی حد تک شروع ہو چکا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد بتدریج اس خطرناک پالیسی پر عمل درآمد بڑھنا شروع ہوا اور غنڈہ ہماری سیاسی زندگی میں ایک فعّال عنصر کی حیثیت سے آگے بڑھنے لگا۔ ایک مدت سے حالت یہ ہے کہ ایک طرف ملک کا نظم و نسق بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت کے کارندے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے بجائے اپنا پورا وقت اور ساری صلاحیتیں برسرِ اقتدار گروہ کے مفادات کی حفاظت اور پاسبانی میں صرف کرتے رہتے ہیں کیونکہ انہی خدمات پر ان کی ملازمت اور ترقی کا سارا دار و مدار ہے۔ دوسری طرف غنڈوں کے اندر اپنی غیر معمولی اہمیت کا شعور بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو معاشرے کے ناپسندیدہ عناصر سمجھنے کے بجائے ملک کی بہت بڑی کارگر، بلکہ فیصلہ کن قوت خیال کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کے دل و دماغ میں یہ زعم پیدا ہو گیا ہے کہ اقتدار کی حفاظت اور اس کے ہاتھوں کی تبدیلی میں انہیں بڑی اہم حیثیت حاصل ہے۔ اونچے طبقوں میں ان کی پذیرائی کی وجہ سے ان کے عزائم بہت بڑھ گئے ہیں اور ان کی مہمات کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ اب وہ حکومت کے کارکنوں سے بالکل بے خوف ہو کر بے گناہ شہریوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ حکومت ان تلخ حقائق سے پوری طرح واقف ہے لیکن وہ ان سے اغماض برتتے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے پر اپنے آپکو مجبور پاتی ہے۔ جب ایک اوباش اور بداخلاق آدمی کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال

کیا جائے تو اسے لامحالہ چھوٹ دینی پڑتی ہے اور اسے اس امر کا اطمینان دلانا پڑتا ہے کہ جو جرم وہ کرے گا اس کی اس سے کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ جب غنڈہ گردی کی سرپرستی نظم و آئین کی پاسبان طاقتیں کرنے لگیں تو اس وبا کا انتہائی خطرناک صورت اختیار کرنا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔

دین سے بے تعلقی

قتل و غارت، غنڈہ گردی اور عزت و آبرو پر حملوں کی بڑھتی ہوئی واردات کے بنیادی اسباب میں سب سے بڑا سبب خدا سے بے خوفی اور دین سے بے تعلقی ہے۔ تہذیب و شائستگی، ضبطِ نفس، انسانی جان اور اس کا احترام پیدا کرنے میں جس قدر خدمت مذہب نے کی ہے، کسی اور چیز نے نہیں کی۔ مذہب ہی انسان کے لطیف احساسات کو ابھارتا اور اس کے اندر رحم اور شفقت کے احساسات کی آبیاری کرتا ہے۔ انسان جتنا مذہب سے دور ہوگا اتنا ہی وہ خود غرض، بے رحم اور شقی القلب ہوگا۔ یہ احساس کہ انسان ایک رُوح رکھتا ہے جسے اگر تکلیف پہنچے تو وہ مالک الملک کے دربار میں ظالم کے خلاف فریاد کرتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ جو کچھ ظلم و ستم وہ کر رہا ہے اسے کوئی علیم و خبیر ذات دیکھ رہی ہے اور اسے دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس ذات کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا ہے، یہ احساسات درحقیقت ضبطِ نفس کے اہم ترین بنیادی محرکات ہیں لیکن اسے اس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ یہاں قوت و طاقت کے اس لازوال خزانے سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے بلکہ مسلسل ایسے اقدام کیے جا رہے ہیں جن سے ہماری نئی پود ان تصورات سے یکسر بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔

معاشرتی ڈھانچے کی تبدیلی

ہمارے معاشرتی ڈھانچے کو جس احمقانہ طریق سے تبدیل کیا جا رہا ہے اس سے بھی جرائم کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ مغربی تہذیب کو اندھا دھند مسلط

کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں بہت سی ذہنی اور اخلاقی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً صبر و قناعت کی جگہ معاشرے میں دولت کی ایک نہ مٹنے والی ہوس اور معیارِ زندگی بلند کرنے کی اندھادھند کوشش نے لے لی ہے اور ہر شخص حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے حدود و قیود سے بالکل آزاد ہو کر اس کے حصول کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اخلاق کی اس پامالی سے انسانی تعلقات کی تقدیس کو شدید نقصان پہنچا ہے اور انسان انہیں مجروح کرنے میں قطعاً کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ لوٹ کھسوٹ کے اس رجحان نے اپنے حدود اور دوسروں کے حقوق کا احترام تو درکنار، احساس تک ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی جان اور اس کی عزت و آبرو کے مقابلے میں بے جان سکّوں کی قیمت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ہم چونکہ مغربی تہذیب کے معمار نہیں بلکہ صرف اس کے نقّال ہیں۔ اس لیے اس کے اندر خیر کے جو پہلو بھی ہیں، انہیں اپنی کم ہمتی کی وجہ سے اپنانے سے قاصر ہیں۔ البتہ اس کی برائیوں کو ہم بڑی سُرعت اور خوشدلی کے ساتھ قبول کر رہے ہیں۔ اہلِ مغرب کی طرح ہم میں نہ تو احساسِ ذمہ داری ہے نہ آئین و قانون اور اجتماعی زندگی کے ضابطوں کا احترام اور نہ اپنے کام اور مقصد کی کوئی گہری لگن۔ ہم نے اگر وہاں سے کچھ لیا بھی ہے تو عُریانی، فحاشی، شراب خوری، تنگ اور چُست لباس، اخلاق سوز فلمیں اور انسانیت سوز ادب۔ ہمارا نوجوان اس بات کا تو بڑا دلدادہ ہے کہ وہ مغربی نوجوانوں کی طرح رقص و سرور کی مجالس میں بے دھڑک شریک ہو، ٹیڈی لباس پہن کر عورتوں پر آوازے کسے، موٹروں اور سکوٹروں کی چوری کرے اور بنکوں اور بڑے بڑے اداروں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے عجیب و غریب منصوبے بنائے۔ لیکن اس کے دل میں یہ جذبہ کبھی موجزن نہیں ہوتا کہ وہ مدرسوں، کالجوں، یونیورسٹی یا کام کاج کے دوسرے مراکز میں اس انہماک، یکسوئی اور ریاضت کا ثبوت دے جو ہمیں مغربی

اداروں، دفاتر اور کارخانوں میں نظر آتی ہے۔ ہماری نئی پود نے مغرب سے جو کچھ لیا ہے اس میں بجز ذہنی اور اخلاقی آوارگی، غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل، ہنگامہ آرائی اور شورش پسندی کے کوئی تعمیری جذبہ نظر نہیں آتا۔ ایک طرف نوجوانوں کے قلب و دماغ میں اس قسم کے خوفناک رجحانات پرورش پا رہے ہیں اور دوسری طرف فلموں اور جاسوسی ناولوں کے ذریعہ انہیں قتل و غارت، ڈاکہ زنی، اغوا اور پھر ان جرائم کی پاداش سے بچنے کے مختلف گُر سکھائے جاتے ہیں جنہیں آزمانے کے لیے وہ مغرب کے اوباش اور آبرو باختہ لوگوں کی تقلید میں بڑے گھناؤنے جرائم کا بے جھجک ارتکاب کرتے ہیں۔ اخبارات میں جرائم کے جو واقعات ہر روز سامنے آتے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بیشتر تعداد ایسے مجرموں کی ہوتی ہے جنہوں نے کہیں دور دراز علاقوں میں قانون کی آنکھ سے چھپ کر تربیت نہیں پائی ہے بلکہ ہمارے ان شہروں کے نہایت ہی مہذب اور بارونق حصّوں میں قانون کے عین سایہ کے نیچے رہ کر یہ تربیت حاصل کی ہے۔ ان کی ٹریننگ کے لیے اب رقص گاہیں، نائٹ کلب، سینما گھر اور اسی قسم کے دوسرے بیشمار مراکز موجود ہیں۔

ہمارے ملک کا معاشرتی نظام جس برق رفتاری سے تبدیل ہو رہا ہے اس نے عوام کو بالکل حواس باختہ کر دیا ہے۔ نت نئی تبدیلیاں، اور خصوصاً ایسی تبدیلیاں جو اُن کے قومی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ ان کی قوتِ فکر اور ان کے انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے لیے انتہائی تباہ کُن ثابت ہو رہی ہیں اور ان سے لوگوں کے افکار و جذبات میں بڑا اختلال پیدا ہو گیا ہے۔ اہلِ یورپ کے ہاں اگر تھوڑا بہت ذہنی اور جذباتی سکون باقی ہے تو اس کی بڑی وجہ یونان اور روم کا وہ فلسفہ اور طرزِ فکر ہے جس کی بنیاد پر مغربی تہذیب کا محل تعمیر کیا گیا ہے لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل غیر معقول اور ناقابلِ فہم ہے۔ ہم اپنے ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام

کو مغربی تہذیب کے عین مطابق تعمیر تو کرنا چاہتے ہیں لیکن اس بات کو یکسر نظر انداز کر رہے ہیں کہ یہ تمدن ایک ایسے مادی طرزِ فکر کا فطری نتیجہ ہے جس نے مدت ہائے دراز تک مغربی ذہنوں کی آبیاری کی ہے۔ اس بنا پر اہلِ مغرب اپنے نظامِ حیات اور فکری پس منظر کے درمیان کوئی تصادم نہیں پاتے اور وہ اس کی جکڑ بندیوں کو بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں مگر پاکستان میں مختلف صورتِ حال درپیش ہے یہاں کے عوام کی عظیم اکثریت کا مزاج بنیادی طور پر اس نظامِ فکر و عقائد کو قبول نہیں کرتا جو اس کے اوپر زبردستی ٹھونسا جا رہا ہے۔ جو نظامِ قلب و دماغ کو مطمئن کیے بغیر مسلط کیا جائے گا وہ لوگوں کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوگا اور اسے نافذ کرنے اور قائم رکھنے کے لیے بہت سی ناروا پابندیوں بلکہ شدید جکڑ بندیوں سے کام لینا پڑے گا۔

اس افسوسناک صورتِ حال نے ہمارے عوام کو اپنے مستقبل سے سخت مایوس کر دیا ہے۔ وہ جب سیاسی زندگی کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنے آپ کو بےبس پاتے ہیں جب تعلیمی نظام میں کسی تبدیلی کے آرزومند ہوتے ہیں تو وہاں انہیں قدم قدم پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ معاشی میدان میں سرمایہ دار بڑے اطمینان کے ساتھ جونک کی طرح ان کا لہو چوستا ہے۔ لیکن وہ اس سے جان نہیں چھڑا سکتے اور اگر کبھی ایسا کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں تو گولیوں سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ بےبسی کے اس عالم میں بعض لوگوں کے جذبات بہک کر بالکل غلط سمت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگتی ہے۔

جرائم روکنے کی تدابیر

بڑھتے ہوئے جرائم کے ان بنیادی اسباب میں سے بہت سے اسباب ایسے ہیں جن کا تدارک حکومت کی تدبیر کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ بعض ایسی تبدیلیوں کے متقاضی ہیں جو افراد کے بس میں نہیں ہیں۔ لیکن نہ تو سب کچھ حکومت کی تدبیر پر موقوف ہے،

اور نہ ہم حکومت کی تدبیر کے انتظار میں قتل و غارت کی اس گرم بازاری کے خاموش تماشائی بن کر بیٹھے رہ سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے جن لوگوں کو بھی اس صورتِ حال کی کربناکی کا کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے جو کچھ بھی وہ کر سکتے ہیں اس میں کوتاہی نہ کریں۔

اس ضمن میں پہلا قدم یہ ہے کہ ہم عوام الناس کے قلب و دماغ میں اس غیر معمولی احترام کا نقش بٹھائیں جو اسلام انسانی جان کے لیے قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ انہیں اس امر کا احساس ہو کہ انسانی جان کا زیاں کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے بلکہ اپنے لیے شدید عذاب کو دعوت دینا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام کافر نہیں ہیں۔ خدا اور رسولؐ اور آخرت کے منکر نہیں ہو گئے ہیں وہ صرف غفلت کا شکار ہیں جسے دور کرنے کے لیے تذکیر کی ضرورت ہے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی ان کی اصلاح کے لیے اگر کوئی چیز کارگر ہو سکتی ہے تو وہ باہر سے لایا ہوا کوئی فلسفہ نہیں بلکہ خدا اور اس کے رسولؐ کی تعلیم و ہدایت ہی ہے۔

جُرمِ قتل کی سنگینی

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے قتل کے پہلے واقعہ کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے اس سے اس جُرم کی سنگینی، اس کے مفاسد اور قاتل کی مجرمانہ ذہنیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ

"آپ انہیں آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا قصہ بے کم و کاست سنا دیجیے۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی (اس پر وہ دوسرا) بولا کہ میں تجھ کو قتل کر کے رہوں گا۔ اس نے جواب دیا اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے

مَا اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ
اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ اِنِّيْٓ
اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ
فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ
وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ۔
فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ
اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ
غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ
كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ
اَخِيْهِ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ
اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ
فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ فَاَصْبَحَ
مِنَ النّٰدِمِيْنَ۔ مِنْ اَجْلِ
ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ
اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا
قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط
وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا
اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ۔ رکوع ۵)

ہاتھ اٹھائے گا تو میں اپنا ہاتھ تجھ پر اٹھانے والا نہیں ہوں کہ تجھے قتل کر ڈالوں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے۔ اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔ آخر کار اس کے نفس نے اسے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ (یہ دیکھ کر) وہ بولا، افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا غرض وہ اپنے کیے پر سخت نادم ہوا۔ اسی باعث ہم نے بنی اسرائیل پر یہ مقرر کر دیا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے ایک انسان کو بچایا اس نے گویا سارے انسانوں کو بچا لیا۔

ان آیات کے مطالعہ سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قتل کا ارادہ ایک ایسے بیمار ذہن کے اندر پرورش پاتا ہے جو انسانیت کے پاکیزہ احساسات سے یکسر محروم ہوچکا ہو اور جس کی ذہنیت اس حد تک بگڑ چکی ہو کہ وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے ان لوگوں کی جان کا دشمن بن جائے جو کامیاب اور بامُراد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل انسانیت کے مشترک احساسات سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ اس کے نفس میں اتنا خُبث بھر جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ البتہ اسے اپنے گرد و پیش جو لوگ بھلے معلوم ہوتے ہیں انہیں مٹانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی ذہنیت کا کوئی سلیم العقل انسان تو مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ یہ مجرمانہ طرزِ فکر وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو باؤلے ہوچکے ہوں۔

اس بیمار ذہنیت کے مقابلے میں ایک صحت مند اور معقول انسان کا رویہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے بھائی کا گلا کاٹنے کے بجائے اس کی زیادتی کو بڑے صبر و تحمل اور بُردباری کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور اپنے دشمن کے ارادۂ قتل پر مطلع ہونے اور اس کے ناپاک عزائم کو جاننے کے باوجود اس غیر انسانی فعل کی اپنی طرف سے ابتداء نہیں کرتا۔ یہاں یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام ہمیں یہ تعلیم نہیں دے رہا کہ ہم خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو قاتل کے حوالے کردیں، یا ظالمانہ حملہ کی مدافعت سے باز رہیں۔ وہ جو چیز ہمارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ دشمن گھات میں لگا ہوا ہے، اپنی حفاظت کی فکر تو کرنی چاہیئے، البتہ اس کے قتل کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔ اور اس بات کو ترجیح دینی چاہیئے کہ ظالمانہ اقدام دوسرے کی طرف سے ہو اور آپ کا دامن ابتداء بالقتل سے بالکل پاک رہے۔ اسی بنا پر بعض اکابر نے خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضؓ کے آخری طرزِ عمل کو اسی آیت کی عملی تفسیر قرار دیا ہے یعنی آپ اقدامِ قتل سے آخر وقت تک اجتناب کرتے رہے۔ اپنا گلا کٹوانا گوارا کرلیا لیکن اس بات کو گوارا نہ کیا کہ کسی مسلمان کے خون سے ان کے ہاتھ رنگین ہوں۔ مشہور مفسر ابنِ کثیر نے

ایوب سختیانی کا مندرجۂ ذیل قول نقل کیا ہے :

ان اول من اخذ بھذہ الایۃ من ھذہ الامۃ عثمان بن عفان رض

"امتِ محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھلایا، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔"

بعض مترجمین نے اِنِّی اَخَافُ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ کا ترجمہ کرتے وقت لفظ "کیونکہ" بڑھا دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہابیل اگر قابیل کی اشتعال انگیزی کے باوجود اس کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے اجتناب کرتا رہا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس کے مقابلہ میں بزدل اور کمزور تھا اور وہ اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اصل میں جو چیز اسے اس اقدام سے باز رکھ رہی تھی وہ پروردگارِ عالم کا خوف تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس حقیقت کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا خوف نہ صرف انسان کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے باز رکھتا ہے بلکہ انتہائی پُر آشوب حالات میں بھی اس کے دماغی توازن کو برقرار رکھنے میں اس کی معاونت اور دستگیری کرتا ہے اور اسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دامن کو ظلم سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

اس موقع پر "رب العالمین" کے الفاظ بھی بڑے معنی خیز ہیں۔ اور قرآن مجید کے کمالِ بلاغت کو ظاہر کرتے ہیں۔ امام راغب نے مفردات میں الرّب کے معنی یہ بیان کیے ہیں ھو انشاء الشیء حالاً فحالاً الی حدّ التمام یعنی رَب وہ ہے جو کسی چیز کو تدریجاً نشو و نما دے کر حدِ کمال تک پہنچائے۔ ہابیل جب قاتلانہ عزائم رکھنے والے بھائی کے مقابلے میں ہر قسم کے اشتعال سے پروردگارِ عالم کے خوف کا ذکر کرتے ہوئے اجتناب کرتا ہے تو اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ وہ انسانی زندگی پر ہاتھ ڈال کر اس نظام سے بغاوت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا جو رب العالمین نے اپنی مخلوق کے حفظ و بقا اور تدریج و ترقی کے لیے قائم کر رکھا ہے وہ اس خدائی نظامِ ربوبیت میں مددگار بننا

چاہتا ہے جس میں انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے اب جو شخص بھی اس مقدس نظام کے خلاف عمل کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا ارتکاب کرتا ہے اسی بنا پر سورۃ الفرقان میں شرک کے بعد دوسرے درجے پر جس جُرمِ عظیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ قتل ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (الفرقان: ۶۸)

"جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔"

پھر قتلِ مومن کے سلسلے میں تو وعید اس سے بھی زیادہ شدید اور سخت ہے اس کی جسارت کرنیوالے کیلئے تو وہی سزا رکھی گئی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (نساء ۹۳)

"اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی جزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔"

احترام انسان سے متعلق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث انسانی جان کے احترام کی تعلیم و تلقین سے بھری پڑی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ کبائر کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا:

اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَقَوْلُ الزُّوْرِ (صحیح مسلم کتاب الایمان، باب الکبائر)

"بڑے گناہ یہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھیرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، انسانی جان کو ہلاک کرنا اور جھوٹ بولنا۔"

دوسری حدیث میں قتلِ نفس کو ماں باپ کی نافرمانی سے پہلے، شرک کے متصل بیان فرمایا گیا ہے:

عن انس بن مالك قال ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم الكبائر او سئل عن الكبائر فقال الشرك بالله وقتل النفس وعقوق الوالدين ۔ صحیح مسلم حوالۂ مذکور

"حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبائر کے بارے میں بیان فرمایا، یا آپ سے کبائر کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ کے ساتھ شرک کرنا، انسان کو قتل کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔"

قتلِ ناحق تو خیر بڑی بات ہے جو شخص اس فعل کے ارتکاب کے متعلق سوچے اور اس کی فکر کرے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی کو دعوت دیتا ہے:

عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه وسلم قال ابغض الناس الى الله ثلٰثة: ملحد في الحرم ومبتغ في الاسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئ بغير حق ليهريق دمه (بخاری۔ کتاب الدیات)

"حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین آدمی سب سے زیادہ مبغوض ہیں ایک وہ جو حرم میں بے اعتدالی کرے (مثلاً خون، خرابہ، شکار وغیرہ) دوسرا وہ جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے چلانے کی کوشش کرے تیسرا وہ جو کسی انسان کا ناحق خون بہانے کے در پے ہو۔"

مسلمان تو مسلمان، اسلام میں تو اس کافر کا خون بہانا بھی گناہِ عظیم ہے جس کو اسلامی حکومت میں ذمّی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہو۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن عبد اللہ ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من قتل نفسًا معاھدًا لم یرح رائحۃ الجنۃ وان ریحھا یوجد من میسرۃ اربعین عامًا ۔ (بخاری کتاب الدیات)

"(حضرت) عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ایسے شخص کو مار ڈالے جس سے معاہدہ کیا جا چکا ہو وہ بہشت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا، حالانکہ بہشت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہو جاتی ہے۔"

اب ذرا ایک نگاہ حضور سرور دو عالمؐ کے ان ارشادات پر بھی ڈال لیں، جو حضورؐ نے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے معاملہ میں مختلف مواقع پر فرمائے ہیں۔ رحمۃ للعالمین نے مسلمان کی صفات بیان کرتے ہوئے اس کی ایک اہم صفت یہ بیان فرمائی ہے:

عن عبد اللہ ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلّم قال المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہٖ (بخاری)

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے یہی حدیث ایک آدھ لفظ کے تغیّر کے ساتھ یوں درج ہے:

قال قلت یا رسول اللہ ایّ الاسلام افضل قال من سلم المسلمون من لسانہٖ ویدہٖ (کتاب الایمان)

"(ابو موسیٰ اشعری) نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کس شخص کا اسلام بہتر ہے؟ فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

مسلمان کے خلاف صف آرا ہونے کو ایک دوسرے مقام پر کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

عن عبد اللہ ابن مسعود قال

"حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے

قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر (صحیح مسلم)

کہ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے۔

حضور سرور دو عالم ؐ نے مسلمانوں کو بڑی تاکید کے ساتھ مسلمان کی جان کے بارے میں وصیت فرمائی اور قتلِ مسلم کو کفر اور ارتداد جیسا گھناؤنا فعل قرار دیا۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم لا ترتدوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض۔ بخاری۔ کتاب الفتن

" حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"

اسی ضمن میں ذرا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر بھی غور کریجیے، جو حضور ؐ نے بڑی دلسوزی اور سخت تاکید کے ساتھ حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں فرمایا تھا:

عن ابی بکرة ان رسول الله صلی الله علیہ وسلم خطب الناس فقال الا تدرون ای یوم ھٰذا؟ قالوا الله ورسولہ اعلم فسکت حتی ظننا انہ سیسمّیہ بغیر اسمہ فقال الیس بیوم النحر قلنا بلیٰ یا رسول الله قال ای بلدٍ ھٰذا الیست بالبلدة قلنا بلیٰ یا رسول الله قال فان دماءکم واموالکم واعراضکم وابشارکم

" حضرت ابوبکرہ رض سے روایت ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا، جانتے ہو یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ؐ سب سے بہتر جانتے ہیں، (ابوبکرہ رض) کہتے ہیں آپ اتنی دیر خاموش رہے کہ ہم خیال کرنے لگے کہ شاید آپ اس دن کا کچھ اور نام رکھنے والے ہیں۔ پھر حضور ؐ نے فرمایا۔ کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول، ہاں آج بے شک یوم النحر ہے۔ پھر آپ ؐ نے فرمایا۔ اچھا یہ شہر کونسا ہے؟ کیا یہ (حرمت والا) شہر (مکّہ) نہیں ہے۔ ہم

عليكم حرام كحرمة يومكم هٰذا في شهركم هذا في بلدكم هٰذا الا هل بلغت قلنا نعم۔ قال اللهم اشهد فليبلغ الشاهد الغائب - (بخاری کتاب الفتن)

نے عرض کیا بے شک یا رسول اللہ یہ حرمت والا شہر مکہ ہی ہے۔ تب آپؐ نے فرمایا۔ دیکھو تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو اور تمہارے جسموں کی کھالیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن کی حرمت اس مہینے اور اس شہر میں سنو، میں نے اللہ کا حکم تم کو پہنچا دیا یا نہیں؟ ہم نے کہا بے شک آپ نے پہنچا دیا۔ اس وقت آپؐ نے دُعا کی اے اللہ گواہ رہیو اور فرمایا جو لوگ یہاں موجود ہیں، میرا یہ کہنا، ان لوگوں تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔"

حضور سرور کائنات نے ایک اور حدیث میں مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانے والوں کو اُمتِ محمدیہ کے دائرہ سے خارج قرار دیا ہے:

عن ابن عمران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من حمل علینا السلاح فلیس منا (مسلم)

" حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔"

جو شخص ایک مرتبہ زبان سے کلمۂ شہادت ادا کر دے۔ خواہ وہ خوف کی وجہ سے ہی ایسا کر رہا ہو۔ اس کے قتل کو بھی اسلام نے گناہِ عظیم قرار دیا ہے۔ حضرت مقداد بن اسود کی روایت ہے:

" انہوں نے کہا یا رسول اللہ! اگر میری کافر سے مڈبھیر ہو جائے اور وہ مجھ پر حملہ کر کے میرا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دے۔ پھر مجھ سے بچ کر ایک درخت

کی اوٹ میں پناہ لے لے اور کہے کہ میں ایمان لے آیا۔ کیا میں اس حالت میں اسے قتل کر دوں؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا اسے مت قتل کرو۔ میں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی۔ یا رسول اللہ اس نے میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے اور اس کے بعد ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ حضورؐ نے پھر فرمایا۔ مت قتل کرو اس کو، اگرچہ تجھ کو اس سے صدمہ پہنچا (اور زخم لگا) اگر تو اسے قتل کرے گا تو اس کا وہی حال ہو گا جو اس جرم کے ارتکاب سے پہلے تیرا حال تھا اور تیرا حال وہ ہو گا جو اس کا حال یہ کلمہ ادا کرتے سے پہلے تھا۔" (صحیح مسلم)

مسلم کے نامور شارح امام نوویؒ نے اس حدیث کے مطلب میں علماء کے اختلاف کو نقل کرنے کے بعد امام شافعیؒ اور ابنِ قصار المالکی کا یہ قول درج کیا ہے۔ "معصوم الدم محرم قتله بعد قوله لا اله الا الله کما کنت انت قبل ان تقتله وانك بعد قتله غیر معصوم الدم ولا محرم القتل کما کان هو قبل قوله لا اله الا الله (نووی شرح مسلم جلد اول صفحہ ۴۹)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اس کا خون ویسا ہی معصوم اور اس کا قتل ویسا ہی حرام ہو گیا جیسا تیرا خون اور تیرا قتل، اسے قتل کرنے سے پہلے تھا، اور تو اسے قتل کرنے کے بعد ویسا ہی ہو گیا جیسا وہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے پہلے تھا۔ یعنی نہ تیرا خون معصوم اور نہ تیرا قتل حرام"۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث جو حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے۔ اس میں بھی حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرنے والے کو قتل کرنے سے بڑے سخت الفاظ میں منع فرمایا ہے:

"حضرت اسامہ بن زیدؓ کا بیان ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے ہمیں ایک جنگی مہم پر بھیجا۔ ہم حرقات کے ایک قبیلہ جہینہ سے نبرد آزما ہوئے۔ ہم نے وہاں ایک شخص کو گرفتار کر لیا۔ اس نے فوراً لا الٰہ الا اللہ کہا۔ لیکن میں نے برچھی

سے اس کو مار دیا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس فعل پر ایک خلش پیدا ہوئی۔ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا۔ کیا اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا۔ اور تُو نے اسے مار ڈالا؟" میں نے عرض کیا۔ اس نے ہتھیار کے خوف سے یہ الفاظ کہے تھے"۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

افلا شققت عن قلبه حتیٰ تعلم اقالها ام لا ؟

"کیا تُو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا تاکہ تجھے معلوم ہوتا کہ اس کے دل نے یہ کلمہ کہا تھا کہ نہیں"۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کا کہنا ہے کہ حضورؐ یہ کلمات بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ میں نے آرزو کی "کاش میں نے اسی دن اسلام قبول کیا ہوتا"۔ اسی حدیث کی ایک دوسری روایت تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ جو منقول ہوئی ہے اس کے آخر میں حضورؐ کے الفاظ ایسے ہیں جن سے اُسامہ کے اس فعل پر آپؐ کے شدید اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضورؐ نے جب اُسامہؓ سے اس واقعہ کے بارے میں دریافت فرمایا تو حضرت اُسامہؓ نے کہا۔ "یارسول اللہ اس نے مسلمانوں کو شدید اذیت دے رکھی تھی۔ اور فلاں فلاں کو شہید کر دیا تھا"۔ اس کی صراحت میں حضرت اُسامہؓ نے چند افراد کے نام بھی لیے۔ پھر کہا: "لیکن جب میں اس پر غالب آیا تو اس نے تلوار کے ڈر سے لا الٰہ الا اللہ کہنا شروع کر دیا"۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ کیا تُو نے پھر بھی اسے قتل کر دیا؟" انہوں نے کہا۔ "ہاں"۔ اس پر رسالتمآب نے فرمایا: فکیف تصنع بلا الٰه الا الله اذا جاءت یوم القیمة تو لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دے گا۔ جب وہ قیامت کے دن پیش ہوگا؟" حضرت اُسامہؓ نے عرض کیا۔ "حضور میرے لیے بخشش کی دعا فرمائیں"۔ لیکن آپ بار بار یہی بات دُہراتے کہ "کیا جواب دے گا تو لا الٰہ الا اللہ کا جب وہ آئے گا قیامت کے دن"۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر بعد قوله لا الٰه الا الله)

قتلِ مومن تو خیر بڑا سنگین جرم ہے حضور سرورِ دو عالمؐ نے تو اس شخص کو بھی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے جو کسی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے عن ابی ھریرۃ قال ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم من اشار الی اخیہ بحدید فان الملائکۃ تلعنہ حتی یدعہ وان کان اخاہ لابیہ وامہ۔ (صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب)

" حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور سرورِ دو عالمؐ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کی طرف لوہے سے (یعنی ہتھیار سے) اشارہ کرے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس سے باز نہ آ جائے خواہ وہ اس کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔"

حضور سرورِ کائنات نے مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ تیروں اور نیزوں کو لے کر یونہی بازاروں، مساجد یا اجتماعی زندگی کے دوسرے مراکز میں آ جائیں۔ انہیں اس ضمن میں اس بات کی سخت ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان کے ضرر رساں حصوں کو پوری طرح ڈھانک کر رکھیں تا کہ ان سے کسی کو غفلت میں بھی کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ امام نووی نے کہا ہے کہ یہ حکم صرف تیر، نیزے یا تلوار پر ہی حاوی نہیں بلکہ اس کے تحت ہر وہ ہتھیار یا چیز آ جاتی ہے جس سے ضرر پہنچنے کا کوئی احتمال موجود ہو۔ (ملاحظہ ہو صحیح مسلم۔ باب من مر بسلاح فی مسجد او سوق .... شرح نووی جلد دوم ص ۳۲۸)

حضور سرورِ کائنات کے ارشاداتِ گرامی اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ قیامت کے روز ایک شخص جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہو گا تو اس سے پہلا سوال انسانی خون کے بارے میں ہی کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ نے حضور کا فرمان یوں روایت کیا ہے:

اول ما یقضی بین الناس یوم القیامۃ فی الدما (صحیح مسلم) "قیامت کے روز لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون کے مقدمات کا فیصلہ کیا جائے گا۔" امام نووی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ جرم بڑا سنگین ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اسی کے بارے میں قیامت کے روز باز پرس کرے گا۔ اس حدیث کا اس

حدیث سے کوئی تعارض نہیں ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے نماز کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ حقوق اللہ میں سے نماز اوّلین اہمیت کی حامل ہے اور حقوق العباد میں انسانی جان کا احترام بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۶)

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ احکام لوگوں کو یاد نہیں رہے۔ اسی وجہ سے مسلمان، مسلمانوں کی گردنیں مار رہے ہیں اور اس بات کا کسی کو کم ہی احساس ہوتا ہے کہ یہ عظیم جرم ہے جس کا بوجھ وہ اپنی گردن پر لے رہا ہے۔ آج ہم اگر اس کی روک تھام کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ان احکام کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچائیں۔ شاید بھولے سبق یاد آنے سے ان کے ہاتھ قتلِ ناحق سے رک جائیں۔

بارہواں باب

اتباعِ اسلام اور خلوصِ عمل

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا فرد یا قوم ہو جس نے اسلام کے کسی نہ کسی اصول کو اپنایا نہ ہو، یا جس کی زندگی کے تمام گوشے اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی ہوں۔ تعلیمات ربانی اتنی فطری، اتنی ہمہ گیر اور اتنی حیات آفریں ہیں کہ ان کے اکثر و بیشتر حصوں کو اپنائے بغیر صحت مند انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ افراد یا قومیں جو نہ صرف اسلام کی دشمن ہیں بلکہ سرے سے مذہب ہی کی مخالف ہیں اور اسے مٹانا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتی ہیں، وہ بھی اسلام کے بہت سے اصولوں کو اپنانے پر مجبور ہیں۔ حتیٰ کہ کافرانہ نظامِ زندگی بھی اپنی بقا، توسیع اور ترقی کے لیے اسلام کے بعض اصول و ضوابط کا محتاج ہے۔ اس وقت روس سے زیادہ مذہبی بیزاری پر کس ملک کو ناز ہے، لیکن وہاں بھی دیکھیے کہ ماں کی عزت و آبرو کی حفاظت، بہن کی عفت کا تحفظ، ماں باپ کا احترام، پڑوسی کے حقوق کا خیال، غریبوں اور بیکسوں کی معاونت اور دستگیری، سماج کے کمزور طبقوں کو سہارا دینے کی آرزو، یہ سب وہ احساسات و جذبات ہیں جن کا سرچشمہ مادیت نہیں بلکہ مذہب ہے۔ ماں باپ اگر ضعیف اور کمزور ہیں اور وہ

قومی آمدنی میں اضافہ کے بجائے اس پر بار ثابت ہو رہے ہوں تو خالص مادی نقطہ نظر سے وہ وطن اور قوم کے دشمن ہیں وہ کسی رعایت اور ہمدردی کے مستحق نہیں۔ انہیں جتنی جلدی ختم کر کے ان کے خون، ہڈیوں اور گوشت کو کام میں لایا جائے اتنا ہی یہ فعل معاشی اعتبار سے مفید اور کارآمد ہے لیکن دنیا کی کوئی قوم بھی یہ خالص معاشی تصورِ حیات اپنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ انسان کے اندر کچھ لطیف احساسات بھی پائے جاتے ہیں جنہیں وہ کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان مقدس احساسات کے دم قدم سے اسکی انسانیت کا بھرم قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے باغی افراد اور مذہب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم رکھنے والی قومیں آج تک مذہب سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکیں۔ مذہب اور اس کی تعلیمات ان کے تحت الشعور میں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام انسان کی فطرت میں داخل ہے تو پھر ایک مومن اور کافر میں یا ایک مسلم اور غیر مسلم قوم کے درمیان کیونکر تفریق کی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم فرد یا مسلم قوم اللہ کے دین کو پورے اخلاص اور یکسوئی کے ساتھ اپنانے کے لیے کوشش کرتی ہے۔ یہ دین ہی اس کی زندگی کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہوتا ہے۔ اس دین سے ہٹ کر یا اس کے کسی پہلو کو نظر انداز کر کے وہ کسی دنیوی اور اخروی بھلائی کا تصور نہیں کر سکتی۔ اسی دین کی پیروی کو وہ اپنی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ سمجھتی ہے۔ اس قوم کے افراد کو ذہنی سکون، قلبی اطمینان اسی دین میں میسر آتا ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل اسی دین میں تلاش کرتی ہے۔ الغرض انفرادی زندگی کی معمولی سے معمولی الجھنوں سے لے کر اجتماعی زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات تک میں دین ہی اس قوم کا اور اس کے ہر فرد کا رہنما ہوتا ہے۔ دین اس قوم کے قلب و دماغ میں، اس کے فہم و احساس میں اور اس کی زندگی کے ہر گوشے میں پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ فرد یا قوم اسی دین کی خاطر جیتی ہے اور اسی کی سربلندی کے لیے مرتی ہے۔ اسی حقیقت کو

باری تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے :

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ - (الانعام - ۱۶۲)

"آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔"

باری تعالیٰ کے ساتھ اس اطاعت شعاری کے مسلک کو چھوڑ کر جو لوگ اسلام کے بعض اصولوں اور ضابطوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنانے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، ان کے طرزِ عمل کو کسی اعتبار سے بھی مخلصانہ اور خدا پرستانہ نہیں کہا جا سکتا۔ انکی اصل غایت خدا کی رضا اور مالک الملک کی خوشنودی اور اس کے فیصلوں پر دل جمعی سے عمل کرنے کا داعیہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے سامنے کچھ دوسرے مقاصد اور دوسرے عزائم رکھتے ہیں۔ البتہ ان مقاصد اور عزائم کی تکمیل میں اگر کچھ دینی اصول اور ضابطے مفید اور کار آمد ہوں تو وہ ان سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ دین کو اپنانا یا احکامِ الٰہی کی پابندی کرنا یا ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو خوش دلی اور ذوق وشوق سے، قصد اور ارادے کے ساتھ اختیار کرنا ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ جس طرح مسافرت میں ہم بسا اوقات ان راستوں پر بھی گزرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ہماری منزلِ مقصود کو نہیں بلکہ دوسری منزلوں کی طرف جاتے ہیں بالکل اسی طرح زندگی کی گزرگاہوں سے گزرتے ہوئے ہمارے قدم چند لمحوں کے لیے ایسے راستوں پر پڑ جاتے ہیں جو ہمیں اپنے نصب العین کی طرف لے جانے والے نہیں بلکہ دوسری سمتوں کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ جو شخص جتنا کسی نصب العین کے حصول کے لیے بیتاب ہوگا اسی نسبت سے وہ زندگی کے ان چوراہوں پر زیادہ محتاط اور چوکس ہو کر گزرے گا کیونکہ یہی وہ اہم اور نازک مقامات ہیں جو اسے تھوڑی سی بے احتیاطی اور غفلت کی وجہ سے غلط راستے پر ڈال کر اصل منزل سے بہت دُور لے جا سکتے ہیں۔ کسی نصب العین کے عشق میں سرشار افراد

اور قومیں ایک لمحہ بھی کسی غلط راہ پر چلنا گوارا نہیں کرتیں۔

کسی نصب العین کے اثرات کسی فرد یا قوم میں اسی وقت نمایاں ہوتے ہیں جب وہ اسے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنالے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ نصب العین کے ساتھ پوری طرح وابستگی پیدا نہیں کرتا تو وہ اس کے ثمرات سے کیونکر بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے مسلم قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس قوم کے رہنما اور اس کے افراد اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ان کا منتہائے مقصود ہے۔ لیکن ان لوگوں کے سوچنے کے انداز، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانے، ان کا تصورِ فلاح، ان کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی افکار اور ان کی عملی سرگرمیوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکے کہ انہوں نے قصد اور ارادہ کے ساتھ دوسرے راستوں کو چھوڑ کر اسلام کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس قوم کے اربابِ اختیار اور اہلِ علم کی باتیں سننے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام ان کے نزدیک ایک دل کش نعرے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس سے وہ صرف عوام کے جذبات سے کھیلنے کا کام لیتے ہیں۔

اسلام سے وابستگی کا تقاضا

اسلام سے وابستگی کا سب سے پہلا ثبوت یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کو اس کے عوام اور خواص کو، اس کے اہلِ علم اور اہلِ دانش کو اس کے سیاست دانوں اور ماہرینِ معیشت کو اور اس کے اربابِ اقتدار کو اس دین پر پورا پورا اعتماد ہو اور وہ اپنے دل میں اس امر کا یقین رکھتے ہوں کہ ان کی اور ان کی قوم کی بہتری کا راز صرف اس دینِ حق کو اپنانے میں مضمر ہے لیکن یہاں ہمیں اسلام پر اعتماد کی جگہ اس کے متعلق بے یقینی، اس کے مستقبل کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک، اس کی تعلیمات کے متعلق متعدد شبہات نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملّت کے اربابِ اختیار اسلام کے ساتھ کچھ دوسرے افکار و نظریات، فلاح و بہبود کے کچھ دوسرے تصورات اور باطل نظامہائے حیات کے کچھ مادہ پرستانہ اصول لیکر

دنیا کے سامنے بطور نصب العین پیش کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے تو ہمیں یہ خوشخبری دی ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

یعنی دین ہمارے لیے ہر لحاظ سے مکمل ہوگیا ہے اور باری تعالیٰ کو احکام کی صورت میں اور ضابطۂ حیات کی شکل میں ہمیں جو ہدایات دینی تھیں وہ ہمیں نبی آخر الزماں ؐ کی وساطت سے مل چکی ہیں۔ اب اس میں کسی ترمیم و اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن ہم اسلام میں سوشلزم کے پیوند لگا کر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ دین ناقص اور نامکمل ہے اور اس کی تکمیل غیر اسلامی عناصر شامل کرنے سے ہو سکتی ہے۔

باری تعالیٰ نے تو ہمیں واضح طور پر یہ بتا دیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ یعنی اللہ کی نظر میں بجز اسلام کوئی دوسرا ضابطۂ حیات، کوئی دوسرا نظریۂ زندگی، کوئی دوسرا اسلوبِ زیست، انفرادی اصلاح یا اجتماعی نظم کا کوئی دوسرا لائحۂ عمل مقبول نہیں۔ لیکن ہم زبان و عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ تنہا اسلام ہمیں منظور نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہمیں کچھ دوسرے ضابطے، کچھ دوسرے اصول بھی درکار ہیں۔ جن کی مدد سے ہم فلاح و کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمان اور غیر متزلزل اعتماد دونوں لازم و ملزوم ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اعتماد ایمان کی خشتِ اوّل ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ جب ہم اللہ اور اس کے رسُول پر ایمان کی اساس ہی سے محروم ہیں تو ہمارے اندر دینِ حق کو اپنانے اور اسے دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا جذبۂ صادق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام کے بارے میں اس عدمِ اعتماد اور بے یقینی نے ہمیں زندہ اور انقلاب انگیز قوم بننے کے بجائے محض راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے جسے باطل کے جھکڑ جس طرف چاہتے ہیں اڑا کرے جاتے ہیں۔ چٹانیں اس وقت تک مربوط و مضبوط رہتی ہیں جب تک ان کے عناصرِ ترکیبی کے درمیان ہم آہنگی اور پیوستگی موجود ہو مگر جب ان کے اجزا خارج سے مختلف اثرات قبول کرنا شروع کر دیں تو

پھر نہ صرف ان کا باہمی ربط غائب ہو جاتا ہے بلکہ ان میں بڑی بڑی دراڑیں اور وسیع شگاف پڑ جاتے ہیں اور یہ چٹانیں بعد میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔

اُمتِ مسلمہ کے انتشار کی صورتیں

اُمتِ مسلمہ کے اندر آج جو ہمہ گیر فساد اور انتشار پایا جاتا ہے، اور جسے اتحاد، تنظیم اور اخوت کے فلک شگاف نعرے اور اتفاق کی برکتوں کے بڑے دل چسپ وعظ بھی دُور نہیں کر سکے، اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ ہم نے اسلام کو دل کی گہرائیوں سے قبول نہیں کیا۔ تصدیق بالقلب بے شبہ غیر مرئی کیفیت ہے لیکن یہ کوئی ایسی غیر محسوس واردات نہیں جس کے اثرات انسانی زندگی کے کسی پہلو میں بھی نمایاں نہ ہونے پائیں۔ یہ ایک مقناطیسی کشش ہے جو سب سے پہلے انسان کے احساسات و جذبات، اس کے افکار و نظریات کے درمیان ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کرتی ہے۔ پھر ایک ہی طرزِ فکر کے حاملین کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑے مضبوط اور پائیدار رشتوں میں جوڑتی ہے۔ ان کے اندر تنظیم اور اتحاد پیدا کرتی ہے اور اس کے بعد ان کی صلاحیتوں کو ایک خاص مقصد کے حصول کی راہ میں لگاتی ہے۔

آج ہمیں مختلف اطراف سے اسلام کے بارے میں عجیب و غریب نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ کہیں اسلامی سوشلزم کی آواز بلند ہوتی ہے، کہیں اسلامی آمریت کے تذکرے ہو رہے ہیں، کہیں اسلام کو جدید بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ الغرض اسلام اِس دَور میں عملِ جراحی کی نازک منزلوں سے گزر رہا ہے۔ اگر یہ صورتِ حال کچھ مدت تک قائم رہی تو اس دین کا اس بری طرح سے حُلیہ بگڑ جائے گا کہ ایک عام آدمی کے لیے دینِ حق کی پہچان مشکل ہو جائے گی۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لے کر اُٹھے ہیں اور اسی میں ملّتِ اسلامیہ کی نجات دیکھتے ہیں، وہ فہم و فراست کے دعوؤں کے باوجود اتنی سادہ سی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دو ان میل نظاموں کے درمیان کس طرح جوڑ قائم ہو سکتا ہے اگر یہ

حضرات اپنے اس دعوے میں مخلص ہیں تو پھر ان کے بارے میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑے فریب میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسا فریب جس کا شکار معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی نہیں ہو سکتا۔ اس دعوے سے ان لوگوں کی اسلام اور سوشلزم دونوں کے بارے میں جہالت اور ناواقفیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ حضرات فی الحقیقت جان بوجھ کر یہ کہہ رہے ہیں تو پھر یہ پوری امت بلکہ پوری انسانیت کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

'اجتماعی عدل' کی جس ترکیب سے یہ قوم کو اُلّو بنانے کا عزم رکھتے ہیں وہ بالکل ایک اضافی تصور ہے جس کے معنی اسلام اور سوشلزم میں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں نظاموں کے درمیان اساسی فرق ہے اور ان کے مابین کوئی چیز بھی قدرِ مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ ان دونوں نظاموں کی بنیادی اقدار ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ ہیں۔ اسلام کا سارا نظام خشتِ اول سے لے کر کنگرے تک خدا پرستی کی بنیاد پر قائم ہے۔ خدا پرستی کا یہ تصور دینِ حق میں اس طرح محض رسم اور تکلف کے طور پر موجود نہیں جس طرح کہ کسی ثقافتی شو یا کسی سینما ہال کے افتتاح کے وقت قرآنِ مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہاں خدا پرستی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا پورا نظام مادی اقدار کے بجائے ان اخلاقی اقدار پر قائم ہے جو ہمیں باری تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے عطا کیا ہے۔ اشتراکیت میں الحاد کی طرح فیصلہ کن قدر کسی چیز کی معاشی اور مادی افادیت ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں آخری، حتمی اور قطعی معیار خدا کی رضا اور اس کی ناراضگی ہے۔ اسلام میں سارے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اخلاقی بنیادوں پر حل کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس اشتمالیت اور اشتراکیت میں سارے معاملات کو جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے طے کیا جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں انفرادی نفع و نقصان کا جو میزانیہ بنتا ہے وہ اخلاقی قدروں اور اخلاقی فلاح و بہبود کے مطابق بنتا ہے اور اشتراکیت یا کسی دوسرے لادینی نظام میں اس میزانیہ میں اصل اہمیت مادی سُود و زیاں کو حاصل ہوتی

ہے۔ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان اس واضح اور بیّن فرق کو ہم یوں تو زندگی کے ہر قدم پر محسوس کرتے ہیں، لیکن میں یہاں چند باتیں بطورِ مثال پیش کرتا ہوں۔

قرآن مجید نے تعدّدِ ازواج کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے کیونکہ وہ حکیم ذات جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہ اس کے مزاج اور اس کی نفسیاتی کیفیات اور اس کی ضروریات سے پوری طرح واقف ہے۔ اسے یہ معلوم ہے کہ ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ رشتۂ مناکحت کبھی ایک انسان کی حقیقی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ آج نفسیات اور حیاتیات میں جو مختلف تحقیقات ہوئی ہیں انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ تعدّدِ ازدواج کی ضرورت بالکل مسلّم اور درست ہے یہاں تک کہ WILL DURRANT (وِل ڈورینٹ) جیسا متعصب اہلِ علم بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جن قوموں نے اپنے ہاں فحاشی کو نیست و نابود کرنا چاہا انہیں تعدّدِ ازدواج کو رواج دینا پڑا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعدّدِ ازواج سے بعض اوقات گھروں میں پیچیدگیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور انہی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے مغربی قوموں نے فحاشی کو اختیار کیا ہے لیکن اسلام کے نزدیک ان پیچیدگیوں کے مقابلے میں فحاشی زیادہ قابلِ مذمت اور بُری ہے اس لیے اس نے تعدّدِ ازواج کی اجازت دی ہے۔

یہی حال ضبطِ تولید کا ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں معاشی استحکام کا بھی ایک مقام ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی مؤثر تدابیر بتائی ہیں لیکن اس کے ہاں اقدار کی جو ترازو نصب ہے اس میں اخلاقی استحکام، معاشی استحکام سے کہیں زیادہ وزنی ہے اس لیے یہاں اصل اہمیت اخلاقی استحکام ہی کو حاصل ہے کیونکہ اس میں بگاڑ پیدا ہونے سے اس کا سارا ڈھانچہ ہل کر رہ جاتا ہے۔

کسی نظامِ حیات میں اصل چیز وہ اقدار ہیں جو مختلف شعبوں اور مختلف افعال و اعمال کے درمیان تناسب کے رشتے قائم کر کے اور ترجیحات کے منصوبے بنا کر ان کی اہمیت

متعین کرتی ہیں۔ ایک نظام جس میں زندگی کے سارے معاملات کو مادی نقطۂ نظر سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ وہاں حلال وحرام اور خوب و ناخوب کے اصل پیمانے مادی فوائد اور نقصانات ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں وہ نظام جو سب سے زیادہ زور اخلاقی قدروں کو دیتا ہے اس میں صحیح اور غلط کا فیصلہ انہی اقدار کے مطابق ہوگا اور انہی کی نسبت سے ساری چیزوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جائے گا۔

ایمان کی کمزوری

مسلم قوم کو آج جو پیچیدہ مسائل درپیش ہیں اور جن کی پیچیدگی ہر روز بڑھتی چلی جارہی ہے ان کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اس سادہ سی حقیقت کو ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پائے اور اس بنا پر بہک کر ہر راہرو کے ساتھ بے سمجھے بوجھے چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے بڑے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ - كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

آل عمران: ۸۶

"اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ناکاموں اور نامرادوں میں سے ہوگا۔ اللہ کیسے ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا۔ جنہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا حالانکہ وہ خود اس بات پر شہادت دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آ چکی ہیں۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے دعوے کے باوجود کسی انسان کو ان پر یقین پیدا نہیں ہوتا اور وہ اس کے دین کے علاوہ کچھ دوسرے افکار و نظریات اور کچھ دوسرے

عقائد و تصورات میں اپنی فلاح ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔

مسلم قوم اس وقت واقعی دنیا میں سب سے زیادہ پست اور پسماندہ ہے۔ یہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی کمزور ہے۔ اسے ہر طرف سے مختلف مصائب گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارا اسلام سے تعلق ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ کی بندگی، اس کے رسُول کی غلامی اور اس کے دین کی اتباع کے دعوے کے باوجود کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں، کچھ دوسرے رہنماؤں کی غلامی کا طوق گلے میں پہن لیا ہے اور احکامِ الٰہی کو نظر انداز کر کے کچھ دوسرے اصول اپنانے کی کوشش کی ہے۔

اسلام کے ساتھ ہمیں زبان کی حد تک تعلق ضرور ہے لیکن اس کے اختیار کرنے کے بعد فکر و نگاہ کے جن زاویوں، عمل کے جن میدانوں اور خوب و ناخوب کے جن پیمانوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہم قطعاً تیار نہیں ہوتے۔ وہ قوم جو دعویٰ تو بندگیٔ رب کا کرے، مگر عملاً زندگی کے کسی شعبے میں اس بندگی کے بنیادی تقاضوں تک کو پورا کرنے پر آمادہ نہ ہو وہ اس دین کی برکات سے کس طرح بہرہ مند ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں جو یہ بار بار آتا ہے کہ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ —— تو اس کے معنی ہی بجز اس کے کیا ہیں کہ راہِ حق پر چلنے میں خواہ تمہیں کتنی دقتیں پیش آئیں، اس میں کتنے ہی موانع حائل ہوں اور اس راہ پر خواہ تمہیں مال و جان کی کتنی ہی قربانی پیش کرنی پڑے تمہیں اس صراطِ مستقیم سے ہٹنا نہ چاہیئے۔ باطل نظامِ حیات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر خدا پرستانہ نظامِ زندگی کی تشکیل اور صحت مند تصورات کی نشو و نما کوئی بچوں کا کھیل نہیں جسے ہنسی خوشی کھیل لیا جائے۔ اس کے لیے اللہ اور اس کے رسُول پر غیر متزلزل یقین، اسلام کے صحیح اور برحق ہونے پر مکمل اعتماد اور اس کی دنیوی اور اخروی برکات اور واحد ذریعۂ نجات ہونے پر مکمل بھروسہ ضروری ہے۔ پھر اس کے مطابق سب سے پہلے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کا عزمِ صمیم اور بالآخر

پوری دنیا پر اس کو غالب کرنے کا عزم اور اس راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں، انہیں برداشت کرنے کی ہمت اور جو قربانیاں دینی پڑیں ان کے لیے رضامندی، ایمان کے بنیادی تقاضے ہیں۔ جب تک ہم ان ساری منازل کو طے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ہم کبھی دنیا میں عزت و آبرو کا کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ دنیا میں بے یقینی سے زیادہ کوئی بڑا گناہ نہیں اور نفاق سے زیادہ کوئی مہلک مرض نہیں۔ ان دونوں سے ہمیں نجات حاصل کرنی چاہیئے۔

ہماری مطبوعات

یہودیت و نصرانیت — سید ابوالاعلیٰ مودودی

۵-اے ذیلدار پارک — "

جدید جاہلیت — محمد قطب

انسانی زندگی میں جمود و ارتقاء — "

ایمان اور اخلاق — پروفیسر عبدالحمید صدیقی

ہمارا نظامِ تعلیم — "

سعید اختر

رحمٰن کے سائے میں — حافظ محمد ادریس

روشنی کے مینار — "

البدر پبلی کیشنز
۲۰-بی اردو بازار لاہور